اغلاط علٰحدہ درج کیے جاتے تو قارئین کو مزید آسانی ہوتی، کتاب کا اخباری سائز ذوق لطیف پر گراں گذرتا ہے، شروع میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی ایک مختصر تحریر بھی ہے، یہ اس کتاب کی خوبی کی ضمانت ہے،

آپ حج کیسے کریں: مرتبہ حافظ محمد یونس صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۴۴، شایع کردہ حکومت پاکستان وزارت مذہبی امور و اقلیتی امور، اسلام آباد،

حج اسلام کا اہم رکن ہے لیکن یہ صاحب استطاعت مسلمانوں پر عمر بھر میں صرف ایک ہی دفعہ فرض ہے اور عام عبادتوں کے مقابلہ میں اس کے احکام و مسائل زیادہ ہیں، جو عموماً لوگوں کو مستحضر نہیں رہتے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے بھی بھول چوک ہو جاتی ہے، اس لئے حج کے ارکان و مناسک ذہن نشین کرانے کیلئے متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جو پاکستان کی وزارت مذہبی امور کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ نہ زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر، اسکی ترتیب اور انداز بیان میں الجھاؤ اور پیچیدگی کے بجائے آسان زبان اور سادہ و عام فہم پیرایہ اختیار کیا ہے اور گھر سے روانگی سے لیکر مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں قیام تک کی تمام اہم باتیں اور ضروری مسنون دعائیں قلمبند کی گئی ہیں، احرام، عمرہ، حج اسکی قسموں، اسکے جملہ ارکان و مناسک، حج کے خاص دنوں کے اعمال، مدینہ منورہ کی حاضری کے آداب، وہاں قیام کے معمولات وغیرہ علٰحدہ علٰحدہ اسطرح بیان کیے گئے ہیں کہ معمولی اور اوسط درجہ کے قاری کو بھی اشتباہ او دقت نہ ہو، آخر میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی ان جگہوں کا ذکر ہے جنکی عموماً حجاج زیارت کرتے ہیں، اس سلسلہ میں مسجدوں اور اکثر اہم جگہوں کے متعلق مختصر نوٹ بھی دئے ہیں، غرض حج کے متعلق یہ بہت مفید اور معلوماتی کتاب ہے اور گو پاکستانیوں کے لیے لکھی گئی ہے مگر ہندوستانی بھی اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اس میں چند چیزیں نظرانداز ہو گئی ہیں جیسے حج بیت اللہ کے مقدس سفر سے گھر تک واپسی کے متعلق ہدایات اور ضروری اور مناسب زاد راہ کے بارے میں مشورے، جہاز کے سلسلہ کی مشکلات اور ان کا حل وغیرہ، احکام و مسائل زیادہ مستند کتابوں سے لکھنا چاہیے تھا،

"ض"

جلد ۱۲۸　ماہ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۱ء　عدد ۵

مضامین

شذرات

گذشتہ مہینہ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے جناب مولانا ابو الحسن علی ندوی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یونیورسٹیاں ارباب کمال کو ایسی ڈگریاں دے کر اپنے وزن اور وقار میں اضافہ کرتی ہیں، کشمیر یونیورسٹی کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اس نے علم و فن کے ایک سیمرغ، خیر و برکت کے ایک ہما اور خوش کلامی و شیوا بیانی کے ایک عندلیب کو اپنے حلقہ میں لے کر اپنی توقیر بڑھائی، ورنہ مولانائے محترم کے رتبہ کا شہباز اب ایک ایسے سدرۃ المنتہیٰ پر بیٹھ چکا ہے کہ جہاں ان کو کسی کلغی کی ضرورت نہیں، خواہ یہ کیسی ہی زریں اور مکلّل ہو، ان کی بامراد زندگی میں بہت سی ساعتیں ایسی آچکی ہیں جو زبانِ حال سے ان سے کہتی رہی ہیں

ع وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

دار المصنفین میں ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو "اسلام اور مستشرقین" پر جو بین الاقوامی سیمنار ہونے والا ہے اس کی تیاری جاری ہے، ایران، مصر، پاکستان اور ہندوستان کے بعض اہل علم نے اس میں اپنی شرکت کی مسرت کا اظہار کیا ہے، ایک صاحب نے تو یہ لکھ کر توجہ دلائی ہے کہ دار المصنفین کی تاسیس تو ان مستشرقین کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے ہی کی خاطر ہوئی، علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النبی جلد اول کے دیباچہ میں ان مستشرقین کے مبلغِ علم کا انکشاف جس طرح کیا ہے اس سے ہندوستان کے علمی حلقہ کے اربابِ قلم کی آنکھیں کھلیں، علامہؒ نے ان مستشرقین ہی کی زبانی یہ کہہ کر ان کی ساری تحقیقات و تلبیسات کا راز کھول دیا تھا،

ع دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

ان شاء اللہ اس سیمنار میں علامہؒ کے اسی اجمال کی تفصیل ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا قلم آج کل بڑا رواں دواں بلکہ پرافشاں ہو رہا ہے، ان کی علمی کاوشوں

ہندوستان کے مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی زندگی میں ان کی بعض تحریریں پڑھیں تو فرمایا تھا کہ بہت دنوں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے علمی افق پر ایک درخشندہ ستارہ نمودار ہوا ہے جو ممکن ہے آگے چل کر اور بھی زیادہ روشن ہو، یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، نظامی صاحب کے دو خاص موضوع ہیں، ایک تو ہندوستان میں اسلامی تصوف اور دوسرا ہندوستان کی تاریخ میں مسلمان حکمرانوں کا عہد، ان دونوں موضوعات پر ان کی بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں۔

۱۹۵۳ء میں ان کی ایک ضخیم کتاب "تاریخ مشائخ چشت" شایع ہوئی تھی، جس سے ان کی بڑی شہرت ہوئی، اس سے اسلامی تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مدد ملی، اور خواجگانِ چشت کا ایسا واضح مرقع سامنے آیا کہ ان کی باطنی تعلیمات سے گرویدگی اور شیفتگی میں بڑا اضافہ ہوا، اس کے پہلے اڈیشن کے ختم ہونے پر نظامی صاحب نے اس پر نظر ثانی شروع کی تو از سر نو تصوف کے رموز و نکات کے زر و جواہرات کا اتنا بڑا انبار لگا دیا کہ پہلے سے اس کی شکل بہت بدل گئی ہے، تاریخ مشائخ چشت کے اس نئے اڈیشن کو پڑھتے وقت قارئین محسوس کریں گے کہ فاضل مصنف نے تصوف کے تخت طاؤس پر بیٹھ کر صاحب قرانی کی ہے، وہ تصوف پر جب کوئی تحریر لکھتے ہیں تو اس میں توانائی، اثر اور قوت نفوذ کے موتی اور یاقوت جھلملاتے نظر آتے ہیں، اس سلسلہ کی سات جلدیں ابھی اور شایع ہوں گی، اگر یہ تمام شایع ہو گئیں تو نظامی صاحب اپنی علمی جگر کاوی کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کے ان فضلاء کی یاد تازہ کر دیں گے جن کے علم و قلم کے ابر باراں سے مسلمانوں کے فضل و کمال کا مرغزار لہلہاتا رہا ہے۔

اس نئے اڈیشن کو ادارۂ ادبیات دلی نے بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب کتابت اور طباعت کے ساتھ شایع کیا ہے، جس سے کتاب کے سونے پر سہاگہ کا کام انجام پا گیا ہے، اتنی عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ اردو میں بہت ہی کم کتابیں شایع ہوئی ہیں، اس کے لیے ادارۂ ادبیات دلی بھی ہر طرح کی مبارکباد کا مستحق ہے۔

اسی ادارۂ ادبیات دلی کی طرف سے نظامی صاحب کی انگریزی میں سپلیمنٹ تو ایلیٹ اینڈ ڈاوسن ہسٹری آف انڈیا کی جلدیں بھی عمدہ چھپائی کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں، یہ ان کا ایک اور شاندار علمی کارنامہ ہے، اس وقت اس کی دو جلدیں میرے سامنے ہیں، ایک جلد کے پیش لفظ اور تمہید میں ایلیٹ کی شر انگیزیوں کا تجزیہ فاضلانہ انداز میں کیا گیا ہے، جس سے قارئین ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کا مطالعہ کرنے میں ایک نیا زاویۂ نظر ملے گا، دوسری جلد کے آغاز میں چودہویں صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کے عنوان سے جو تمہیدی باب ہے

اس میں فاضل مصنف کی تحقیقی دیدہ وری کے ساتھ ان کے نظری استدلال فکری استنباط اور استخراج نتیجہ کا بڑا خوشگوار امتزاج ہے ایسی تحریروں سے مسلمانوں کے عہد کی بہت سی غلطیاں دور ہو جائیں گی جو انگریزوں اور ان کی تقلید میں بعض انتہا پسند ہندو مورخوں نے سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے پیدا کردی ہیں۔

دونوں جلدوں میں غزنویوں سے لے کر تغلقوں کے عہد تک ان تمام ماخذوں کا احاطہ ہے جو ایلیٹ کی رسائی سے باہر ہے، ان میں ایسی تمام مذہبی، فقہی، شعری، ادبی، جغرافیائی، اثری، صوفیانہ اور فلسفیانہ کتابوں اور تحریروں کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے کچھ نہ کچھ مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، موجودہ دور میں ان عہدوں پر جو کتابیں یا مضامین لکھے گئے ان کا بھی تفصیلی ذکر ہے، ظاہر ہے ان کو اکٹھا کرنے میں شمع نیم شبی بھی بہت جلی ہوگی اور خواب صبح گاہی کو معلوم نہیں کس کس طرح حرام کرنا پڑا ہوگا، ایلیٹ کی آٹھ جلدوں کی طرح یہ ضمیمے بھی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہوں گے جن کی اشاعت کے بعد ریسرچ کرنے والوں کو مسلمانوں کے دور کی تاریخ کے وہ سارے ضروری ماخذ معلوم ہو جائیں گے جو وہ جاننا چاہیں گے، ادارہ ادبیات دلی بھی داد کا مستحق ہے کہ وہ نظامی صاحب کے سینے کے خزینے کو دیدہ زیب سفینے میں محفوظ کر رہا ہے۔

اس ملک میں ادارہ ادبیات دلی ہی شاید انگریزی کا ایک ناشر کتب ہے جس کے مالک ایک صاحب ذوق اور صاحب عزم مسلمان ہیں، اب تک اس کی طرف سے تقریباً اسی کتابیں شایع ہو چکی ہیں، جو مسلمانوں کی مذہبی تاریخی اور علمی سرگرمیوں سے متعلق ہیں، ان سے ایک طرح اخلاص کا ظہور ہو رہا ہے، ان ہی مطبوعات میں علامہ شبلیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" کا انگریزی ترجمہ "عالمگیر" کے نام سے شایع ہوا ہے جو خاکسار راقم کا کیا ہوا ہے۔

گذشتہ مہینہ بمبئی کے جناب اے۔ اے۔ فیضی کی وفات ہو گئی، وہ ۱۹۱۹ء سے دار المصنفین کے لائف ممبر تھے، اپنی نظر و فکر میں جدید کاری اور ترقی پسندی کے باوجود آخر وقت تک علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین اور معارف کے بڑے قدردان رہے، بمبئی جب جانے کا اتفاق ہوا تو وہ ایک شفیق بزرگ ہی کی طرح ملے، ان کے مذہبی اور فقہی خیالات کا احتساب تو وہاں ہوگا جہاں اب دائمی طور پر پہونچ گئے ہیں، مگر ان میں بعض ایسی شریفانہ خوبیاں تھیں جن کو ان کے معاصر دوست اور ملنے والے مدتوں یاد کریں گے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی ادا پسند آجائے جس سے ان کی مغفرت کا سامان ہو جائے آمین۔

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنجشکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات "راحت القلوب" کا مطالعہ

از مولانا اخلاق حسین دہلوی

راحت القلوب (فارسی نسخہ) مطبوعہ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء مطبع قاسمی میرٹھ حجم ۴۸ صفحات سائز ۲۶×۲۰ مسطرہ ۲۵ سطری، قلم خفی، یہ چوبیس مجالس ملفوظات کے بیانات کا مجموعہ ہے جو حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کے ملفوظات پر مشتمل ہے، اس کے جامع حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء ہیں رحمۃ اللہ علیہ، اس کتاب کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ فی الحال چند اوراق منتشرہ کا مجموعہ ہے۔

۱. استناد و قدامت یہ صحیح ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کے ملفوظات کو جمع فرمایا تھا، چنانچہ ۲۸ شوال ۷۰۷ھ کی مجلس میں آپ نے فرمایا:

کلماتے کہ از شیخ استماع داشتم بنوشتم تا ایں غایت آں مجموعہ بر من است۔	جو باتیں میں نے اپنے شیخ سے سنیں وہ میں نے لکھ لیں، اور وہ مجموعۂ ملفوظات میرے پاس محفوظ و موجود ہے۔
(فوائد الفواد ص ۳۱)	

اس بیان کا تعلق خواجہ امیر حسن علاء سجزی کی اس عرضداشت سے ہے جو انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے

ملفوظات کو جمع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے حضرت والا کی خدمت میں پیش کی تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا تعلق اجازت سے بھی ہے اور ہمت افزائی سے بھی ہے، اس گفتگو میں کتاب کے نام سے متعارف کرانا خالی از تکلف نہ ہوتا، کیونکہ مدعا اسی سے حاصل تھا جو کچھ آپ نے فرمایا تھا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "تا ایں غایت آں مجموعہ برمن است" اس سے بخوبی یہ مترشح ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات معروف و متداول نہ تھا، اس لیے بھی نام سے متعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جو بھی آداب مجلسی سے آگاہ اور رمز شناس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ضمنی اذکار میں صورت حال یہی ہوتی ہے کہ کتاب کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ کبھی اشارہ کنایہ سے اور کبھی مصنف کے ذکر پر اکتفا کر لیا جاتا ہے کہ فلاں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، خیر المجالس میں اور متعدد کتب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ ارشاد اقتضائے حال کے بالکل مطابق ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو کتاب آج ان ملفوظات پر مشتمل مانی جاتی ہے اور مانی جاتی رہی ہے اور جو معروف و متداول ہے اور داخلی و خارجی شواہد بھی اس کے حق میں ہیں، پھر بھی وہ کوئی اور کتاب ہے مذکورہ ملفوظات کا مجموعہ نہیں ہے، یہ منطق لایعنی ہے، قابل قبول نہیں ہے، آیندہ شواہد بتائیں گے کہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کا ذکر محبوب الٰہیؒ نے فرمایا تھا۔

یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق نکتہ ہے کہ یہ مجموعۂ ملفوظات حضرت محبوب الٰہیؒ کو اس قدر مرغوب و محبوب تھا کہ نصف صدی کے قریب مدت گذر چکی تھی، مگر آپ نے اسے کلیجے سے لگائے رکھا اور ضائع ہونے نہ دیا تھا، کتنے پیارے فرمایا ہے "تا ایں غایت آں مجموعہ برمن است" مزید یہ بھی فرمایا:

هم دراں ایام مردے مرا کاغذہائے	ان دنوں میں ایک شخص نے سفید کاغذ
سفید داد یکجا جلد کردہ، من آں را	یکجا جلد بستہ مجھے دیئے، جو میں نے لے لیے

لہ (حاشیہ ص ۳۳۱ پر)

بستدم، فوائد شیخ هم دراں ثبت کردم بالا	اور ان میں حضرت شیخ کے فرمودہ فوائد د
بنشتم سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ	اشارات قلم بند کیے، اوپر لکھا سبحان اللہ
واللہ اکبر و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم	والحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر و لا حول
(فوائد الفواد ص ۳۱)	و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ان بیانات سے بخوبی ثابت ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جمع فرمائے تھے، جو آٹھویں صدی ہجری کے ربع اول تک آپ کے پاس محفوظ و موجود تھے، مگر ظن غالب یہ ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات متداول و معروف نہ تھا، اگر ہوتا تو عادۃً ذکر کی ضرورت نہ ہوتی تاہم اس کے مبارک نام کی اطلاع ہمیں اس سے قریب ترعہد ہی میں شمائل الانقیاء و دلائل الاتقیاءؒ سے

(حاشیہ ص ۳۳۰) پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس عبارت کا کہ "مردے مرا کاغذہائے سفید داد یکجا جلد کردہ" یہ ترجمہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا (حضرت نظام الدین اولیا، حیات و تعلیمات، ص ۹۸) یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، کاغذہا میں علامت جمع موجود ہے، ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک شخص نے جلد بستہ سفید کاغذوں کی بیاض مجھے دی۔

لہ مطبوعہ نسخہ راحت القلوب (فارسی) میں کلمۂ تمجید سبحان اللہ الخ بھی بالائی حصہ میں مرقوم نہیں ہے، مجھے بھی اس باب میں تردد تھا، مگر مطالعہ نے رہنمائی کی اور میرا یہ تردد رفع ہو گیا، مطالعہ نے یہ بتایا کہ حوادثات روزگار سے نقل و کتابت میں اس قسم کے سہو کثرت واقع ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، یہ تو ہے بھی بے تعلق عبارت، ممکن ہے کسی نے اسی بے تعلقی سے متاثر ہو کر اسے حذف کر دیا ہو، اور فوائد الفواد کا بیان اس کے مطالعہ میں نہ ہو، یا ذہن میں محفوظ نہ ہو، قلمی کتابوں میں بعض مربوط عبارتوں کے ایسے جملے بھی محذوف ملتے ہیں، جن سے عبارت بے ربط ہو جاتی ہے، اس کا تدارک یہ ہے کہ قلمی نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے، بلاشبہہ یہ تردد رفع ہو جائے گا، بنظر اختصار نسخے ہی پر اکتفا مناسب ہے، تاہم اہل علم کے نزدیک ایسی خامی کسی کتاب کے جعلی ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتی، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر کسی قلمی نسخے میں بھی یہ عبارت نہیں ہے؟ شمائل الانقیاء و دلائل الاتقیاء کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے اور ایک نسخہ

(بقیہ ص ۳۳۲ پر)

ملتی ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے معزز خلیفہ مولانا برہان الدین غریبؒ (المتوفی ۷۳۲ھ) کے ایمارے اور ان ہی کی نگرانی میں ان کے لائق ترین مرید و مستند اہل قلم مولانا رکن الدین عماد کاشانی دبیرؒ نے تالیف کی تھی جس کی فہرستِ ماخذات میں اس کا نام موجود و مرقوم ہے۔

محلِ غور ہے کہ مولانا برہان الدین غریب علیہ الرحمۃ سالہا سال اور مدت مدید تک حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں رہے اور قریب تر رہے، اور وہ ایسے محب صادق اور برگزیدہ بزرگ تھے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ انھیں عزیز رکھتے اور ان کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے، حتیٰ کہ مولانا برہان الدین غریبؒ کی وفات کے بعد بھی مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کی اس روش میں فرق نہ آیا، وہ حولی ماحولی سال کے سال ان کا عرس کرتے اور خراجِ محبت پیش کیا کرتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر اس بدگمانی کی گنجائش کہاں رہتی ہے کہ مولانا برہان الدین غریبؒ جیسے جلیل القدر اور طبقۂ اولیٰ کے بزرگ اس سے واقف نہ ہوں کہ وہ مجموعۂ ملفوظات جو راحت القلوب کے نام سے منسوب ہے، ان ملفوظات پر مشتمل نہیں ہے جن کا ذکر خیر حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان مبارک پر آیا ہے اگر ایسا ہوتا اور راحت القلوب کوئی جعلی کتاب ہوتی تو یقیناً وہ ہرگز یہ گوارا نہ کرتے کہ اسے فہرست ماخذات میں شامل کیا جائے، لہٰذا شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کی فہرست ماخذات میں راحت القلوب کا شمول

(بقیہ ص ۳۳۱) خدا بخش اور پٹنہ پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے، اور یہ اسی نام سے ہیں، ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۶۸ھ کا مکتوبہ ہے، حضرت مولانا نسیم احمد فریدی صاحب مدظلہ العالی مفتی امروہہ نے عاریۃً مجھے بھیجا تھا جس سے میں نے استفادہ کیا ہے، اس کی فہرست ماخذات میں ڈیڑھ سو (۱۵۰) سے زیادہ کتب و رسائل کے نام مندرج ہیں، ان میں سے متعدد کتابیں ایسی ہیں جو نایاب و کمیاب ہیں، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۷۹ء کے حاشیہ میں ہے کہ یہ کتاب ۱۳۴۷ھ میں اشرف پریس حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے شمائل الاتقیاء نام سے شائع ہوئی تھی۔

اور اس کو حضرت محبوب الٰہیؒ کی تالیف قرار دینا اس کا بین ثبوت ہے کہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا تھا۔

۷۲۵ھ میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے پردہ فرمایا، ۷۲۷ھ عہد محمد تغلق میں دہلی کا انخلا عمل میں آیا اور بقول ابن بطوطہ دہلی میں کوئی بھی متنفس نہیں رہا تھا، ظن غالب یہ ہے کہ خواجہ رفیع الدین ہارونؒ جنھیں حضرت محبوب الٰہیؒ نے متولی خانہ و حظیرہ بنایا تھا، وہ حضرت کے موقوفہ کتب خانے کو اپنے ہمراہ دیوگیر (دولت آباد) لے گئے ہوں گے، ممکن ہے کہ وہیں مولانا برہان الدین غریبؒ نے یا مولانا رکن الدین کاشانیؒ نے وہ نسخہ لے لیا ہو جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی تحویل میں تھا، یا اس کی نقل حاصل کر لی ہو اور جب ہی سے اس کا نام زبان زدِ خلائق ہوا ہو۔

یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ اتنی قلیل مدت میں اور افراتفری کے زمانہ میں کسی نے جعلی کتاب کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنے کی جسارت کی ہو، اور مولانا برہان الدین غریبؒ جیسے بزرگ نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہو، یہ بدگمانی ہے اور سخت قسم کی بدگمانی ہے، کوئی دانشور اس لایعنی منطق کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس کے برعکس ایسے شواہد بکثرت دستیاب ہوتے ہیں کہ بالیقین راحت القلوب ان ہی ملفوظات پر مشتمل ہے، جن کی طرف حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایما فرمایا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ایک بزرگ و عالم مرید مولانا محمد مجیر وجیہ ادیب کی تصنیف کتاب مفتاح الجنان[1] ہے، جو انھوں نے ۷۵۶ھ میں لکھنی شروع کی تھی جس کی تصحیح خواجہ کمال الدین علامہ نے فرمائی تھی، اس میں وہ ملفوظات بکثرت منقول ہیں جو راحت القلوب کے سوا دیگر دستیاب شدہ کسی مجموعۂ ملفوظات میں نہیں ہیں، اور یہ امر

[1] مفتاح الجنان کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے، اور ایک نسخہ راقم کے پاس ہے، ممکن ہے اور کہیں بھی ہو۔

بلاشبہ راحت القلوب کے استناد اور قدامت کی روشن دلیل ہے۔

صاحبِ سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ نے بھی حضرت باباصاحبؒ کے ان ملفوظات کا ذکر کیا ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے قلمبند فرمائے تھے، انھوں نے لکھا ہے:

"بعضے ملفوظاتِ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز سلطان المشائخ قدس اللہ سرہٗ العزیز بخطِ مبارک خود در قلم آورد" (سیر الاولیاء ص ۷۴ پ)

یہ صحیح ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ نے اس مجموعۂ ملفوظات کا نام نہیں لکھا، اس کے گوناگوں اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً حضرت محبوب الٰہیؒ کی اتباع مقصود ہو یا انھیں کوئی ناقص نسخہ دستیاب ہوا ہو، انھوں نے درر نظامی اور خیر المجالس کا بھی ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہ ان کے معاصرین کی یادگار ہیں، ان کا نام نہ لکھنا یا ذکر نہ کرنا ہرگز کسی کتاب کے جعلی اور وضعی ہونے کی یا عدم وجود کی دلیل نہیں ہو سکتی، خصوصاً اس لیے کہ ان سے پیشرو اور ان سے زیادہ معتمد و معتبر حضرات نے راحت القلوب سے استفادہ کیا اور نام لکھا ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) عہدِ مغلیہ میں جلیل القدر عالم و درویش اور باکمال اہلِ قلم گذرے ہیں، انھوں نے بھی ان مجموعۂ ملفوظات کا ذکر کیا اور لکھا ہے[1]:

"بعضے ملفوظات گنج شکرؒ کہ بخط شیخ نظام الدین اولیاء یافتہ اند مکتوب می گردد"

(اخبار الاخیار ص ۵۲ مطبع مجتبائی)

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اصولِ تصوف سے بھی بہرۂ کامل رکھتے تھے، اور تعلیمات اسلامی سے بھی، ان جیسے باکمال بزرگ سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی نومولود اور جعلی نسخے کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب فرماتے اور اس سے استفادہ کرتے، یا کسی ایسے نسخۂ ملفوظات کو حضرت باباصاحبؒ کے

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اسرار الاولیاء کا ذکر کیا ہے، انھوں نے کہیں مشائخ چشت کی کتب ملفوظات سے انکار نہیں کیا ہے۔

ملفوظات سے تعبیر کرتے جو تعلیمات اسلامی یا اصول تصوف کے خلاف مضامین پر مشتمل ہوتا، بلاشبہ اگر وہ کم علمی یا بد احتیاطی کا شائبہ بھی پاتے تو ان کی حق گوئی ہرگز اس کے اظہار میں تامل نہ کرتی۔

شاہ محمد بولاق مرحوم وابستگانِ درگاہِ حضرت محبوب الٰہیؒ سے تھے، خوش گو شاعر اور باکمال اہلِ قلم تھے، انھوں نے ۱۱۱۱ھ / ۱۶۹۹ء میں مطلوب الطالبین[1] نام سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی سوانحِ حیات لکھی تھی، راحت القلوب سے استفادہ کیا ہے اور حوالہ دیا ہے، الغرض متعدد کتبِ تذکرہ و تصوف میں متواتر راحت القلوب کا ذکر ملتا ہے، حتیٰ کہ چودھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم و عارف خواجہ غلام فرید چشتی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) کی زبان مبارک پر بھی راحت القلوب کا ذکر آیا، اور انھوں نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی حکمت اس طرح ہے کہ مشائخ عظام کے ملفوظات مثلاً حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الدین گنجشکر قدس اللہ سرہٗ کے ملفوظات سیر الاولیاء اور راحت القلوب میں بھی شیخ علی احمد صابر رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں آیا" (مقابیس المجالس ص ۷۶۴ ترجمہ[2])

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ کا مجموعۂ ملفوظات مقابیس المجالس کا مطالعہ شاہد ہے کہ حضرت خواجہؒ علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے تھے، کثیر المطالعہ تھے اور نگاہ تنقید سے مطالعہ فرماتے تھے۔

کتبِ تذکرہ و ملفوظات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جاتا ہے تو قدم قدم پر راحت القلوب کی قدامت اور اس کے استناد کے شواہد دستیاب ہوتے اور اس کی روایتیں منقول ملتی ہیں، اور اس کے

[1] مطلوب الطالبین کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے اور ایک نسخہ راقم کے پاس ہے۔ [2] مقابیس المجالس کے مترجم نے اس عبارت کے متعلق جو حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے اس میں کتب ملفوظات مشائخ چشت کو جعلی ثابت کرنے کی ناکام اور لائقِ ندامت کوشش کی ہے جو سخن فہمی اور نکتہ دانی کے منافی ہے، بلاشبہ ایک جلیل القدر عالم و عارف کے مقابلہ میں یہ سطحی اور لایعنی اظہار رائے قابل ندامت جسارت ہے۔

جعلی و وضعی اور نومولود ہونے کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے، اور اس کے معتبر و قدیم ہونے میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

بلا شبہہ حوادثِ روزگار سے متاثر ہونا فطری امر ہے، جس سے چارۂ کار نہیں، قلمی کتابیں اکثر و بیشتر اس سے متاثر ملتی ہیں، بلا شبہہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے، جن کا ذکر خیر حضرت محبوب الٰہیؒ کی مبارک زبان پر آیا تھا، راحت القلوب صحیفۂ رشد و ہدایت بھی ہے، اور اہل دل کے لیے سرمۂ چشم بھی ہے، اس کے مطالعہ سے نیکی و نکوکاری کا ولولہ موجزن ہوتا اور توفیقِ عمل نصیب ہوتی ہے۔

۲. جعلی کا وسوسہ | جعلی کا وسوسہ بعض ان مستشرقین کو لاحق ہوا ہے جو صحیح ذوقِ تصوف نہیں رکھتے، اور جو شعورِ دینی سے عاری ہیں، اور انھوں نے بصیرت کی نگاہ سے راحت القلوب کا مطالعہ نہیں کیا ہے، انھیں خیر المجالس اور جوامع الکلم کی دو ایسی عبارتوں سے مغالطہ ہوا ہے جو الحاقی ہیں، مبہم و بے معنی اور بے ربط ہیں، اور میزانِ سخن پر صحیح نہیں اترتیں، بلکہ ناقص و از کار رفتہ ثابت ہوتی ہیں، جب صحیح تنقیدی شعور سے پرکھا جاتا ہے، تو ان کی قباحتیں واضح ہو جاتی ہیں، اور جعلی کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے۔[1]

۳. تاریخی اندراجات | جب کسی ایسی قدیم کتاب پر اظہارِ خیال مقصود ہو، جس میں تاریخی اندراج ہوں، تو مناسب یہ ہے کہ پہلے تاریخی اندراجات کا جائزہ لے لیا جائے، اگر صحیح اور معتبر ذرائع سے محفوظ ہیں تو فہو المراد، ورنہ انھیں مسترد قرار دیا جائے، اور صحیح تاریخی اندراجات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، اور صحیح تاریخی اندراجات کی روشنی میں واقعات کو پرکھا جائے، ورنہ کیا دھرا سب اکارت جائے گا۔

---

[1] خیر المجالس اور جوامع الکلم کی مذکورہ عبارتوں کی حقیقت سے واقفیت کے لیے مضمون عنوانی "مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات" کا مطالعہ کار آمد ہے جو معارف، اعظم گڈھ اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر ۱۹۷۹ء میں شایع ہو چکا ہے۔

متعدد وجوہ کی بنا پر تاریخی اندراجات صحیح نہیں رہتے، حتیٰ کہ اس قسم سے تاریخ کی قدیم و معتبر کتابیں بھی مبرا نہیں ہیں، یہ طریقہ سنجیدہ اہل علم کا نہیں ہے کہ غلط تاریخی اندراجات کو اساس بنا کر کسی کتاب کے مندرجات کو خلافِ واقعہ اور کتاب کو جعلی و نامعتبر قرار دیا جائے، اگر یہ روش اختیار کی جائیگی تو طبقاتِ ناصری منہاج سراج، تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی اور تاریخ فرشتہ ابو القاسم ہندو شاہ فرشتہ میں مندرج متعدد واقعات کو خلافِ واقعہ اور ان کتابوں کو نامعتبر یا جعلی قرار دینا ہوگا، گویا کہ غلط تاریخی اندراجات کو بلا تحقیق معتبر مان کر واقعات کو پرکھنا صریحاً غلط ہے، جو ایسا کرتا ہے، وہ دراصل علمی قدروں سے بے بہرہ ہے، اور اس کی کارکردگی ہرگز قابلِ اعتنا نہیں۔

الغرض ان مراعات کے ساتھ ہمیں راحت القلوب کے تاریخی اندراجات کا جائزہ لینا ہے، فی الحال میرے پیش نظر راحت القلوب کا مطبوعہ فارسی نسخہ بھی ہے، اور اس کا وہ ترجمہ بھی ہے، جو مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں کتاب "ملفوظات خواجگانِ چشت" کے مجموعہ میں شایع کیا تھا، تراجم اور بھی ہیں، مگر فی الحال ان ہی دونوں نسخوں سے تاریخی اندراجات نقل کیے جاتے ہیں، جن سے ان کی نوعیت و کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔

۴ — تاریخی اندراجات کا نقشہ

فارسی نسخہ راحت القلوب	ترجمہ بریاں	
۱. بدھ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ	بدھ ۱۱ رجب ۶۵۵ھ	تقویم میں ۱۵ رجب کو اتوار ہے ۱۱ رجب کو پیر ہے بدھ نہ پندرہ کو ہے نہ گیارہ کو
۲. جمعرات ۱۶ شعبان ”	ہفتہ ۱۶ ر ”	۱۶ شعبان کو بدھ ہے ۱۶ رجب کو پیر ہے
۳. پیر ۲۱ ماہ مذکور ”	بدھ ۲ ر ”	۲۰ شعبان کو اتوار ہے ۲ رجب کو ہفتہ ہے ۲۷ رجب کو بدھ ہے
۴. نداردو ۲۷ ” ”	منگل ۲۷ ر ”	
۵. جمعرات ۲۹ شعبان ”	جمعرات ۱۰ شعبان ”	۲۹ شعبان کو منگل ہے ۱۰ شعبان کو جمعرات ہے

فارسی نسخہ راحت القلوب	ترجمہ بریاں	
۶۔ ندارد ۱۱ر ماہ مذکور	ندارد ۱۱ر ماہ مذکور	
۷۔ " ۱۳ر ماہ مذکور	" ۱۳ ماہ مذکور	
۸۔ " ۲۵ر "	" ۲۵ "	
۹۔ " ۵ر رمضان	" ۵ر رمضان	
۱۰۔ پیر ۲۵ر شوال	" ۵ر شوال	۲۵ر شوال کو پیر ہے
۱۱۔ ندارد ۱۵ر ماہ مذکور	" ۵ر "	ایک ہی تاریخ میں دو مجلسیں ہیں یہ کیوں؟
۱۲۔ " ۲۰ر "	" ۱۰ر "	
۱۳۔ " ۲۱ر " ۶۵۵ھ	" ۲۱ر ماہ مذکور	
۱۴۔ " ۱۰ر ذیقعدہ ۶۵۵ھ	" ۲ر ذیقعدہ	
۱۵۔ " ۱۲ر "	" ۱۲ر "	
۱۶۔ " ۲ر ذی الحجہ	" ۲ر ذی الحجہ	
۱۷۔ " ۷ر "	" ۱۷ر "	
۱۸۔ " ۲۰ر ماہ مذکور	" ۲۰ر "	
۱۹۔ " ۲۷ر "	" ۲۷ر "	
۲۰۔ " یکم ماہ محرم ۶۵۶ھ	" یکم محرم ۶۵۶ھ	
۲۱۔ " ۱۰ر ماہ مذکور	" ۹ر ماہ مذکور	
۲۲۔ " ۴ر ماہ صفر	" ۴ر صفر	
۲۳۔ " ۲۷ر ماہ مذکور	" ۲۵ر "	
۲۴۔ " ۲ر ربیع الاول	" ۲ر ربیع الاول	

اس نقشہ کے تقابلی مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ راحت القلوب کے فارسی نسخہ میں اور ترجمہ بریاں میں تاریخوں کے ساتھ صرف پانچ پانچ دن لکھے ہیں، ان کا تقویم سے مقابلہ ہو سکتا ہے، باقی چونکہ نا تمام ہیں لہٰذا ان کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ ان پانچ پانچ کے تقابل سے یہ واضح ہے کہ صرف ایک ایک دن تقویم کے مطابق ہے، باقی نہیں۔

اس نقشہ کے تقابلی مطالعہ سے اور بھی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں:

(۱) دن اگرچہ صرف پانچ پانچ تاریخوں کے ساتھ ہیں لیکن ایک ایک کے سوا تقویم سے کسی کی تصدیق نہیں ہوتی، باقی سب ہی غلط اور ناقابل قبول ہیں۔

(۲) فارسی نسخے میں کسی مہینے کی کوئی تاریخ ہے تو ترجمہ بریاں میں کوئی اور تاریخ ہے، مثلاً فارسی نسخے میں ۲۔۳۔۴۔۵ مجلسوں کی تاریخیں ۱۶ر ۲۰ر ۲۷ر ۲۹ر شعبان ہیں اور ترجمہ بریاں میں ۱۶ر ۲ر ۲۷ر رجب اور ۱۰ر شعبان ہیں، مہینے کا بھی فرق ہے، اگر ترجمہ فارسی متن ہی کے مطابق ہے، دن بھی بدلے ہوئے ہیں، یہ اس قدر اختلافات کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ اندراجات کسی اور کی صوابدید کا ثمرہ ہوں۔

(۳) مہینوں میں فرق ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے، اور سنین میں اس سے بھی زیادہ۔

(۴) اہم ترین بات یہ ہے کہ فارسی نسخہ میں ۲۹ر شعبان کے بعد ۱۱ر ۱۳ر ۱۵ر تاریخیں ہیں، جن کے ساتھ ماہ مذکور لکھا ہے، اسی طرح ۲۵ر شوال کے بعد ۱۵ر ۲۰ر ۲۱ر تاریخیں ہیں، ان کے ساتھ بھی ماہ مذکور لکھا ہے۔ اگر یہ تاریخیں شعبان و شوال ہی کی ہیں تو ۲۹ر اور ۲۵ر کے بعد کیوں ہیں؟ ان سے پہلے ہونی چاہیے تھیں، اگر کسی اور مہینے کی ہیں تو اس کا نام ہونا چاہیے تھا، یہ حالات بتاتے ہیں کہ فارسی مطبوعہ نسخہ کسی محفوظ نسخے سے منقول نہیں ہے، بلکہ کسی ایسے نسخے سے منقول ہے جو اوراقِ منتشرہ کا مجموعہ تھا، اور تاریخی اندراج کے باب میں نہایت درجہ ناقص تھا، البتہ اس سے یہ ثابت ہے کہ

کوئی جعلی نسخہ بھی نہیں تھا، کیونکہ کوئی جعل ساز افشائے راز کے خوف سے اس بے ہنگامی کو ہرگز گوارا نہیں کرتا، یہ ناشر کی دیانت داری کا ہے کہ اس نے جوں کا توں شایع کر دیا۔

(۵) سنین قطعاً غلط ہیں، راحت القلوب کی پہلی مجلس کے آغاز میں ۱۵ رجب ۶۵۵ھ اور آخری مجلس کے آغاز میں ۲ ربیع الاول ۶۵۶ھ مندرج ہے، یا تو یہ صحیح پڑھے نہیں جا سکے ہیں یا غلط بیانات سے متاثر ہو کر کسی نے تبدیل کر دیے ہیں، کیونکہ بعض ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جو غلط فہمی اور غلط بیانی پر مبنی ہیں، الغرض تا وقتیکہ مصدقہ اقوال کی روشنی میں ان اندراجات کا جائزہ نہ لیا جائے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخی اندراجات کا جائزہ

ان تاریخی اندراجات کا جائزہ ان مصدقہ بیانات و اقوال کی روشنی میں لیا جا سکتا ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت، ارادت اور خلافت و وفات سے متعلق معتبر کتابوں میں ملتے ہیں، جن میں سے بعض حضرت محبوب الٰہیؒ ہی کے اقوال و بیانات ہیں، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی تاریخ وفات کے متعلق لکھا ہے:

ہیژدہم ماہ ربیع الآخر خمس و عشرین و سبعمائۃ	اٹھارہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ ہجری کو سورج
بعد طلوع آفتاب سلطان المشائخ بجوار رحمت	نکلنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ جوار رحمت
رب العلمین پیوست (سیر الاولیا ص ۱۵۵ پ)	رب العلمین میں تشریف لے گئے، وصال فرمایا

امیر خورد کرمانیؒ نے آپ کی عمر عزیز کے متعلق یہ بھی صراحت فرمائی ہے:

عمر عزیز سلطان المشائخ ہشتاد سال	حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر اسّی سال کی
گشتہ (سیر الاولیا ص ۱۳۴ پ)	ہو گئی تھی۔

خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے اندازاً پچھتر برس کی بتائی ہے (جوامع الکلم مجلس ۱۴ شعبان ۸۰۲ھ قلمی نسخہ) خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ ایک واسطے سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسلک تھے، انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو دیکھا بھی نہ تھا، مگر جو روایت انھیں بزرگوں سے پہونچی، انھوں نے اسے دہرا دیا ہے جس کا تعلق اندازے اور تخمینے سے ہے۔

اس کے برعکس امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو دیکھا تھا، آپ ہی کے بابرکت عہد حیات میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور آپ ہی سے شرف بیعت و ارادت حاصل کیا تھا، اس لیے امیر خورد کرمانیؒ کے بیان کو ترجیح ہے۔ اس کے علاوہ امیر خورد کرمانیؒ کے دادا بزرگوار سید محمد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہم خرقہ تھے اور ان دونوں بزرگوں میں باہم ایسے خوشگوار تعلقات تھے کہ حضرت باباصاحبؒ نے ان دونوں بزرگوں کو رشتۂ مواخات میں منسلک فرما دیا تھا (سیر الاولیا ص ۲۰۹ پ) اسی لیے سید محمد کرمانیؒ مع اہل و عیال دلی چلے آئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہمراہ زندگی بسر کی، ان کے بعد ان کی اولاد در اولاد بھی حضرت ہی کے سایۂ عاطفت میں رہی جس پر حضرت محبوب الٰہیؒ خصوصی شفقت فرماتے تھے، ان حالات کے پیش نظر بھی امیر خورد کرمانیؒ ہی کے قول کو ترجیح ہے، تاہم یہ واضح ہے کہ متقدمین کی نگاہ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر عزیز زمانۂ وفات کے قریب اسّی سال سے زیادہ نہ تھی، اور ان موقر بیانات کے مقابلہ میں بعد کے کسی بے سند بیان کو فوقیت نہیں ہو سکتی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ وفات ۷۲۵ھ ہے، اور عمر عزیز اسّی برس کی ہوئی ہے، اس اعتبار سے آپ کا سنہ ولادت ۶۴۵ھ قرار پاتا ہے، جو درویش صفت بادشاہ سلطان ناصر الدین محمود کا عہد معدلت مہد ہے، اس کے علاوہ سنہ ولادت کی تصدیق دیگر بیانات سے بھی ہوتی ہے، امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں:-

می فرمود کہ روز چہار شنبہ آخریں ماہ صفر	آپ فرماتے تھے کہ صفر کے مہینے کا آخری بدھ
قوی بابرکت است ...... ومی فرمود	بہت برکت والا دن ہے ...... اور

گرتولد ایں ضعیف ہم دریں روز است۔

(سیرالاولیاء ص ۳۸۷ چ)

یہ بھی فرماتے تھے کہ میری ولادت اسی دن کی ہے، یعنی آخری بدھ کی ہے۔

اس اعتبار سے بعض اہل قلم نے آپ کا یوم ولادت آخری بدھ ۲۷ صفر لکھا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ ۶۳۵ھ میں ۲۷ صفر کو بروئے تقویم آخری بدھ ہی ہے (تقویم ہجری وعیسوی ابو النصر خالد) بعض سوانح نگاروں نے آپ کا سنہ ولادت ۶۳۴ھ اور ۶۳۶ھ لکھا ہے، جو خلاف تحقیق اور غلط ہے۔ شاہ محمد بولاق مرحوم لکھتے ہیں:

صاحب سیرالاولیاء در باب ہفتم فی نکتۂ اورادہفتہ وسالینہ گذارش می نماید و ثبت می فرماید کہ تولد سلطان المشائخ بروز آخریں چہار شنبہ بعد از طلوع آفتاب بتاریخ بست و ہفتم شہر صفر سنہ ست و ثلثین و ستمائۃ ۶۳۶ھ بتعداد و سال شش صد و سی و شش بوقوع آمد (روضۂ اقطاب ص ۵۰)

صاحب سیرالاولیاء نے ساتویں باب کے نکتۂ اوراد ہفتہ وسالینہ میں لکھا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ آخری بدھ کو آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد ۲۷ ماہ صفر سنہ ۶۳۶ ہجری کو پیدا ہوئے۔

مطلوب الطالبین ص ۸ قلمی)

شاہ محمد بولاق مرحوم کا یہ بیان اگرچہ سیرالاولیاء سے ماخوذ و منقول معلوم ہوتا ہے، مگر حیرت ہے کہ سیرالاولیاء میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت سے متعلق صرف وہی دو جملے ہیں جو نقل کیے جا چکے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) روز چہار شنبہ آخریں ماہ صفر قوی بابرکت است (۲) تولد ایں ضعیف ہم دریں روز است۔

(سیرالاولیاء ص ۳۸۷ چ)

ان جملوں میں نہ کوئی سنہ ہے، نہ کوئی تاریخ اور نہ کوئی وقت، نہیں معلوم شاہ محمد بولاق مرحوم کو کیا مغالطہ ہوا ہے کہ انھوں نے سنہ کا اور تاریخ و وقت کا اضافہ فرما دیا ہے، اور یہ معلومات انھیں کہاں سے حاصل ہوئیں، جو انھوں نے صاحب سیرالاولیاء امیر خورد کرمانیؒ سے منسوب فرمادی ہے، جو سیرالاولیاء کے دستیاب شدہ قدیم نسخوں میں بھی نہیں ہے، ان کے اس غیر مصدقہ بیان میں ۶۳۶ھ نہایت درجہ غلط ہے جس سے ان ہی کے بیان میں مطابقت برقرار نہیں رہتی، کیونکہ بروئے تقویم ۲۷ صفر ۶۳۶ھ کو آخریں چہارشنبہ (آخری بدھ) نہیں ہے، بلکہ شنبہ (ہفتہ۔ سنیچر) ہے، آخریں چہار شنبہ (آخری بدھ) ۲۴ صفر ۶۳۶ھ کو ہے (تقویم ہجری وعیسوی ابو نصر خالد) لہٰذا ان کا تعین سنہ ۶۳۶ھ غلط اور صریحاً غلط ہے، مزید براں اس سے امیر خورد کرمانیؒ کی نوشتہ عمر اور سنہ وفات سے بھی مطابقت برقرار نہیں رہتی۔

پھر یہ نکتہ بھی ہے کہ اگر امیر خورد کرمانیؒ یہ تفصیل لکھی ہوتی تو وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت باسعادت کے ذکر کے ساتھ ہی لکھتے جو سیرالاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن) کے صفحہ ۹۵ میں ہے، غیر متعلق باب میں اتنی تفصیل سے کیوں لکھتے، بہرحال شاہ محمد بولاق مرحوم کا مذکورہ بیان نہ تو سیرالاولیاء سے ماخوذ ہے اور نہ صحیح ہے، اور نہ قابل قبول ہے، شاہ محمد بولاق مرحوم نے ایسا ہی یہ بیان بھی نقل کیا ہے جو نہایت درجہ مشتبہ و مشکوک ہے، بلکہ سراسر غلط ہے، انھوں نے لکھا ہے:

سید محمد کرمانیؒ مرید خاص وے در کتاب سیرالاولیاء کہ تصنیف و تالیف اوست سنہ عمر شریف در ایام مرض موت آں حضرت بہ ہیچ کہ باید در باب چہارم فی نکتۂ خلافتہا مقرر و معین می نماید کہ چوں عمر سلطان المشائخ بہشتاد و نہ رسید . . . . .

(روضۂ اقطاب ص ۵۷)

سید محمد کرمانیؒ آپ کے خاص مرید نے سیرالاولیاء میں جو ان ہی کی تصنیف و تالیف ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرض موت کے دنوں میں آپ کی عمر شریف جس طرح کہ چاہیے تھی چوتھے باب میں (اور) خلافت کے نکتہ میں مقرر و معین فرمائی ہے، وہ یہ کہ جب آپ کی عمر شریف نواسی ۸۹ سال کی ہوئی تھی۔

مگر حیرت یہ ہے کہ سیر الاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن ص ۱۲۴) باب چہارم اور نکتۂ خلافت میں ہشتاد و نہ (نواسی) نہیں ہے، بلکہ ہشتاد سال کشید (اسی سال کی ہوئی) ہے، اور یہی صحیح ہے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ان بیانات کے مطابق بھی ہے جو بیعت وارادت سے متعلق ہیں اور جنھیں امیر خورد کرمانیؒ نے پوری احتیاط سے قلمبند کیا ہے، جن کا ذکر آیندہ آئے گا۔

بہر حال شاہ محمد بولاق مرحوم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنۂ ولادت جو ۶۳۶ھ لکھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، جو مدت عمر لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اور ان کا سیر الاولیاء سے ماخوذ بتانا بھی صحیح نہیں ہے۔

مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ترجمہ سیر الاولیاء میں جو انھوں نے ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں اردو سیر الاولیاء کے نام سے شایع کیا تھا، غالباً شاہ محمد بولاق مرحوم کے بیان سے متاثر ہو کر ذکر وفات کے ضمن میں "واضح ہو" کے تحت یہ بیان الحاق فرمایا ہے:

"واضح ہو کہ جناب سلطان المشائخ قدس سرہٗ رجب کی پندرہویں(۱۵) تاریخ ۶۵۵ھ میں شیخ شیوخ العالم کی شرف ارادت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت آپ کی بیس(۲۰) سال کی عمر تھی، آپ کی ولادت ۶۳۶ھ میں ہوئی اور انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا، اور جس وقت آپ کا انتقال ہوا اس وقت آپ کی عمر نواسی(۸۹) برس کی تھی (اردو سیر الاولیاء (ترجمہ بریاں) پندرہواں نکتہ ص ۱۶۲)

مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم کو اگر یہ اضافہ کرنا ہی تھا تو مناسب یہ تھا کہ وہ اسے حاشیہ میں لکھتے اور بتاتے کہ یہ ان ہی کی جدت طبع کا ثمرہ ہے، جو سراسر غلط ہے، اس طرح الحاق کر دینا بلاشبہہ نہایت ہی نامناسب ہے، بہر حال سیر الاولیاء کے کسی فارسی نسخے میں ایسی کوئی عبارت نہیں ہے جس کا اس الحاقی بیان کو ترجمہ کہا جا سکے، میں سمجھتا ہوں کہ ترجمہ بریاں ہی سے بعض اہل قلم کو مغالطہ ہوا ہے،

پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے پیش نظر بھی غالباً ترجمہ بریاں ہی تھا، انھوں نے لکھا ہے:

"امیر خورد لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت آپ کی عمر نواسی(۸۹) سال کی تھی، لیکن یہ صرف اندازہ معلوم ہوتا ہے"

(کتاب حضرت نظام الدین اولیاء حیات و تعلیمات ص ۱۲۷)

امیر خورد کرمانیؒ نے آپ کی عمر عزیز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ نقل کیا جا چکا ہے، دراصل یہ شاہ محمد بولاق مرحوم کی اختراع ہے جسے مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ترجمہ سیر الاولیاء میں الحاق زاد دیا ہے، جس سے متعدد اہل قلم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جن صاحبوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت ۶۳۴ھ لکھا ہے، انھوں نے بھی صحیح نہیں لکھا، ۶۳۴ھ میں آخری بدھ ۲۶ صفر کو ہے، اور اس کے اعتبار سے عمر ۹۱ سال ہوئی ہے جو خلافِ تحقیق اور غلط ہے۔

۶. بیعت وخلافت سے متعلق صحیح بیانات

یہ ذکر آچکا ہے کہ راحت القلوب میں مرقومہ تاریخی اندراجات اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مفروضہ سنینِ ولادت ۶۳۶ھ اور ۶۳۴ھ کی تصدیق ان مصدقہ بیانات سے بھی نہیں ہوتی جو بیعت وخلافت سے متعلق ہیں اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے فرمودہ یا نوشتہ ہیں، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے:

سلطان المشائخ بقلم خود نبشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کاتب حروف را بخواند، در روز آدینہ بعد فراغ نماز بیست و پنجم ماہ جمادی الاول سنہ تسع وستین وست مائۃ لعاب دہن مبارک در دہن کاتب کرد و وصیت بحفظ کلام اللہ المجید رزقہ اللہ تعالیٰ فرمود ...... (سیر الاولیاء ص ۱۲۳ چ)

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مبارک قلم سے لکھا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ نے جمعہ کے دن نماز سے فارغ ہونے کے بعد ۲۵ جمادی الاول ۶۶۹ھ کو مجھے بلایا اور اپنے مبارک دہن کا لعاب میرے منہ میں ڈالا اور قرآن پاک کو حفظ کرنے کی وصیت فرمائی۔

امیر خورد کرمانیؒ نے اسی دوران قیام کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے:

در غرۂ مبارک شعبان سنہ تسع وستین و ست مائیۃ از حضرت شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز التماس نمودہ آمد، شیخ شیوخ العالم باجابت و مدد فاتحہ مقرون فرمود۔

(سیر الاولیا ص ۱۲۳ ج)

شعبان ۶۶۹ھ کی پہلی تاریخ کو حضرت باباصاحبؒ سے دعا کے لیے درخواست کی جو آپ نے منظور فرمائی اور فاتحۂ خیر سے مدد فرمائی، یعنی دعا فرمائی۔

اسی دوران قیام کا یہ تیسرا واقعہ بھی ہے جو امیر خورد کرمانیؒ نے نقل کیا ہے:

سہ کرت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ العالم رفتم، بعدہ یک روز خواجہ طلبید سیزدہم ماہ رمضان سنہ تسع وستین وست مائیۃ بود، فرمود کہ نظام! یاد داری آنکہ گفتہ بودم گفتم آرے۔ فرمود کہ کاغذ بیارید، اجازت نامہ بنویسند، کاغذ آوردند، و اجازت نامہ بخشند۔

(سیر الاولیا ص ۱۱۶ ج)

میں تین[۳] بار دہلی سے حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، تیسری بار حاضر ہونے کے بعد ایک دن حضرت باباصاحبؒ نے مجھے بلایا، رمضان المبارک ۶۶۹ھ کی تیرہویں تاریخ تھی، دریافت فرمایا: نظام! تمھیں یاد ہے جو میں نے کہا تھا؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! یاد ہے، آپ نے فرمایا: کاغذ لاؤ تاکہ اجازت نامہ (خلافت نامہ) لکھا جائے، کاغذ لا دیا اور اجازت نامہ لکھا گیا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ پہلی بار حاضر خدمت ہوئے تھے تو حضرت باباصاحبؒ نے یہ دعا کہ دائم الفضل علی البریۃ الخ آپ کو عنایت فرمائی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا:

ایں دعا را یاد گیر و مواظبت نمائی تا ترا خلیفۂ خود گردانم (سیر الاولیا ص ۱۱۶ ج)

اس دعا کو یاد کرلو، اور ہمیشہ پڑھتے رہو، تاکہ میں تمھیں اپنا خلیفہ بنا دوں۔

یہ سوال کہ یاد داری آنکہ گفتہ بودم؟ اسی دعا کے متعلق تھا، الغرض ان تینوں بیانوں سے یہ واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ ۶۶۹ھ میں حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھے اور ان ہی ایام میں حضرت باباصاحبؒ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا اور سند خلافت عنایت فرمائی تھی، خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے:

مرا در ماہ شوال بدہلی فرستادہ بود، نقل ایشاں در شب پنجم ماہ محرم بودہ است،

(فوائد الفؤاد ص ۵۲)

مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا تھا اور حضرت باباصاحبؒ کا انتقال پانچویں محرم کی رات کو ہوا ہے۔

بروئے تحقیق حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ ہے، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا فرمودہ قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

چو در ذات خدا شد محو مطلق — فرید الدین کہ او گنج شکر بود
بہ مظہر گفت ہاتف سال نقلش — فرید الدین ولی واصل حق
۶۷۰ھ

بہر حال مذکورہ بیانات سے یہ واضح ہے کہ ماہ جمادی الاول ۶۶۹ھ سے شوال ۶۶۹ھ تک حضرت محبوب الٰہیؒ کا قیام اجودھن (پاکپتن) میں تھا، اور آپ حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں تھے، یہ تیسری بار کی حاضری تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے:

سہ کرت بخدمت شیخ الاسلام فرید الحق والشرع والدین قدس اللہ سرہ العزیز رفتہ بودم ہر سال یک بار، بعد ازاں کہ نقل فرمود ہفت بار دیگر رفتہ شدہ است (فوائد الفؤاد ص ۴۲)
سیر الاولیا ص ۱۰۷ ج

میں تین[۳] بار حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں (اس طرح کہ) سال میں ایک بار، اس کے بعد کہ آپ کا انتقال ہوگیا تو سات بار اور جانا ہوا ہے۔

اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت باباصاحبؒ کی خدمت فیض درجت میں سال میں ایک بار حاضر ہوتے تھے، اس طرح کہ آئے ہوئے پورا سال گذرنے نہ پاتا تھا کہ آپ دہلی سے اجودھن (پاکپتن) تشریف لے جاتے اور حاضر خدمت ہوتے تھے، آمد و رفت میں کتنا وقت لگتا تھا، صحیح نہیں بتایا جاسکتا، گمان غالب یہ ہے کہ بیس۲۰ دن کا سفر ہوتا تھا، اس اعتبار سے چھ۶ بار کی آمد و رفت میں چار۴ ماہ کی مدت صرف ہوئی ہوگی، اور تین۳ بار کے دہلی اور اجودھن (پاکپتن) کے قیام میں چار سال کی مدت قرین قیاس ہے، گویا کہ سفر و حضر کی مدت چار ساڑھے چار سال ہوگی، اگر اس سفر و حضر کی مدت کو ۶۶۹ھ میں سے وضع کر دیا جائے تو پہلا سفر ۶۶۹ھ میں قرار پاتا ہے، گویا کہ ۶۶۵ھ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کو شرفِ بیعت حاصل ہوا تھا، کسی نے آپ سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ

شما چند سالہ بودید کہ بدولت ارادت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین طیب اللہ مرقدہٗ مشرف شدے فرمود بیست۲۰ سالہ۔

آپ کی کتنی عمر تھی، جب آپ حضرت باباصاحبؒ سے بیعت ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ بیس۲۰ سال کی تھی۔

(سیر الاولیاء ص ۱۰۷، اچ)

۶۶۵ھ جو آپ کی پہلی حاضری اور بیعت ہونے کا سنہ متعین ہوا ہے، اس میں سے اگر بیس۲۰ سالہ عمر وضع کر دی جائے تو سنہ ولادت ۶۴۵ قرار پاتا ہے، یہ وہی سنہ ہے جو سنہ وفات ۷۲۵ھ میں اسّی سالہ مدت عمر وضع کرنے سے حاصل ہوتا ہے، گویا کہ ہر دو اعتبار سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت ۶۴۵ھ قرار پاتا ہے، اور داخلی شواہد سے بھی اس کی پوری پوری تائید ہوتی ہے، اور اس طرح آپ کا سنہ بیعت و ارادت ۶۶۵ھ متعین ہوتا ہے، ۶۵۵ھ نہیں ہوتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سات سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی متعدد سوانحِ حیات لکھی جاچکی ہیں، اور سوانح نگاروں نے قیاس و تجسس سے سنین کی تعیین کی ہے، لیکن کسی نے بھی حقائق سے اور داخلی شواہد سے کام نہیں لیا، اور بمصداق وکثیرٌ اما یقلد الساھون الساھین (علامہ ابن ہمامؒ) بھولے بھٹکے بھولے بھٹکوں کے قدم بقدم چلتے رہے، بعض لوگوں نے اگر کچھ کیا تو یہ کیا کہ اپنی اختراعات کو صاحبِ سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ کے سر تھوپ دیا جو نہایت درجہ نازیبا ہے، اس سے سنین میں اور بھی خلفشار پیدا ہوگیا ہے، اور واقعات کے تطابق میں مزید دشواری لاحق ہوگئی ہے، اور معاندین کو اعتراض کا موقع ہاتھ آگیا ہے، مگر یہ پیرانِ عظام رحمہم اللہ کی کرامت یا ان کی توجہ کا ثمرہ ہے کہ اتنی مدت تک حقایق حقہ محفوظ رہے، اور مجھ ناچیز کو اللہ پاک نے ان کے انکشاف کی سعادت نصیب فرمائی، الحمد للہ علیٰ ذٰلک ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

الغرض اس تحقیق کے دوران حضرت محبوب الٰہیؒ کے سوانح حیات سے متعلق اہم واقعات کے جو سنین مجھے دستیاب ہو سکے ہیں، مفاد عامہ کے لیے انھیں ترتیب وار پیش کیے دیتا ہوں، یقین ہے کہ کارآمد ثابت ہوں گے۔

۷۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی سوانح حیات سے متعلق اہم سنین کا نقشہ

(۱) ولادت	۶۴۵ھ	(۶) غیاث پور میں قیام کی ابتداء	۶۸۰ھ تا ۶۸۶ھ کے درمیان
(۲) دہلی تشریف لانا	۶۶۱ھ	(۷) سلطان بلبن کی وفات اور کیقباد کی تخت نشینی	۶۸۶ھ
(۳) بیعت ہونا	۶۶۵ھ	(۸) محضر سماع بعہد سلطان تغلق	۷۲۴-۷۲۳ھ
(۴) خلافت کی سند ملنا	۶۶۹ھ	(۹) وفات بعمر ۸۰ سال	۷۲۵ھ
(۵) مشارق الانوار کی سند ملنا	۶۷۹ھ		

۸۔ راحت القلوب کا عہد تدوین | اس تفصیل و تحقیق سے یہ واضح ہے کہ راحت القلوب کا عہد تدوین ۶۶۵ھ تا ۶۶۹ھ ہے، وجوہ کچھ بھی ہوں، تحریف ہو یا الحاق، کاتب و ناقل کا سہو ہو یا کسی کی غلط فہمی،

بہر حال، راحت القلوب کی مجالس کے آغاز میں جو تاریخی اندراجات ہیں، وہ غلط ہیں، ان پر اعتماد نہیں
کیا جاسکتا، اور نہ ان کی بنا پر راحت القلوب کو جعلی اور وضعی قرار دیا جاسکتا ہے، اگر یہ غلط روش اختیار
کی جائے گی اور اس غلط کو صحیح سمجھا جائے گا تو بہت سی معتبر کتابوں کو جعلی اور وضعی قرار دینا ہوگا۔

اس عہد تدوین کے صحیح اور معتبر ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے بہت سے شبہات
اور بہت سے مغالطے رفع ہو جاتے ہیں اور کسی معترض کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ فلاں بزرگ
بقید حیات تھے، اور ان کا ذکر بطور متوفی کے ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیان غلط نہیں ہے، بلکہ
تاریخی اندراج غلط اور صحت طلب ہے، اس عہد تدوین کے تعین سے تاریخی اندراج کی صحت ہو جاتی ہے،
ان شاء اللہ اب کوئی مغالطہ لاحق نہ ہوگا۔

۹۔ تذکروں میں سنین | تذکروں میں جو سنین مرقوم ملتے ہیں، ان میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ غلط ہیں، ان کی
بے ثباتی اس سے ظاہر ہے کہ بعض سنین مختلف ملتے ہیں، تاوقتیکہ تحقیق کی کسوٹی پر ان کو پرکھا نہ جائے،
نہ تو ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی کو کسی پر ترجیح دی جاسکتی ہے، قیاساً کسی کو ترجیح دینا صحیح
نہ ہوگا، اور اگرچہ راحت القلوب دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں، اور غلط تاریخی اندراجات بھی اثر انداز
ہیں، لیکن جہاں تک متن کا تعلق ہے اس کی صحت سے انکار ہرگز مناسب نہیں ہے۔

۱۰۔ تحقیقی کارنامہ | تحقیقی کارنامہ کیسا ہی صحت مند ہو، حرف آخر نہیں ہوا کرتا، تحقیق کا میدان
بہت وسیع ہے، اولوالعزم جب میدان عمل میں اترتے ہیں تو کچھ نہ کچھ کرکے دکھاتے ہی ہیں،
مجھے بھی یہ دعویٰ نہیں کہ میری یہ تحقیق حرف آخر ہے، مجھ سے جو بن پڑا بفضلہ تعالیٰ اپنی بساط کے
مطابق میں نے کر دکھایا ہے، یہ نشان راہ ہے، جو زبان حال سے کہہ رہا ہے:

ع۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم، دراصل یہ کرامت ہے چشم بینا کے لیے ان بزرگوں کی جو

چودھویں صدی کی تاریکی میں چراغ راہ ہے ؎

صریر قلمم دریں شب تار
بے معنی خفتہ کرد بیدار

۱۱۔ نقل روایت | یہ انسانی فطرت ہے کہ جو روایتیں اور حکایتیں مجالس وعظ و نصائح میں سنی
جاتی ہیں یا کتابوں میں پڑھتے ہیں انھیں برمحل بیان بھی کر دیا کرتے ہیں، صوفیہ کرام بھی بزرگان سلف
سے مروی روایات کو بیان فرمایا کرتے تھے، بلکہ ملفوظات مشائخ کے مطالعہ کی تاکید بھی فرماتے تھے،
قرآن پاک سے بھی اس کا استحسان واضح ہے۔

جو علم مجلسی سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ بیان کرنے والا خواہ ایک ہی شخص ہو، لیکن
جب کسی ایک روایت کو مختلف مجالس میں بیان کرتا ہے تو حالات کے اقتضاء سے اسلوب و جزئیات
میں فرق پڑ جاتا ہے، اس امتیاز کو نقل میں بے احتیاطی سے وہی تعبیر کرے گا جو بیان کی نفسیات سے
نابلد ہوگا، فوائد الفواد صفحات ۱۷۲ و ۱۷۶ - ۱۹۵ و ۲۰۲ - ۵۲۱ و ۵۹ میں، اور
خیر المجالس صفحات ۱۳۱ و ۱۳۷ میں ایسی ہی روایتیں ہیں جن سے اس اسلوبی امتیاز کی تصدیق
ہوتی ہے۔ جن کے بیان کرنے والے بھی ایک ہی ایک بزرگ ہیں اور لکھنے والے بھی ایک ہی ایک
صاحب کمال ہیں، مگر اسلوب کا یہ امتیاز پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے، البتہ بعض جملے
ایسے ہوتے ہیں جو بعینہٖ برقرار رہتے ہیں، بلکہ ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

راحت القلوب کی روایات کو بھی بیان کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا ہے، فوائد الفواد
میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جو راحت القلوب سے ماخوذ ہیں، اور اسلوبی امتیاز کے وصف سے
مالامال ہیں، ہونی بھی چاہیے تھیں، کیونکہ وہ روایتیں حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ
کی مبارک زبان سے سنی اور لکھی تھیں، جن کے بعض بعض جملے آپ کو ازبر تھے، تاہم اسلوب کا
بعینہٖ برقرار رہنا خلاف فطرت ہے، بعض جملے جو برجستہ اور رواں ہوتے ہیں، وہ زبان زد

رہتے ہیں، اور جوں کے توں منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور وہی مشترک اور برقرار رہتے ہیں، وہ دونوں کتابوں میں ہیں، اشعار کا اعادہ بھی ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے، جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، بہر حال ایسی بعض روایتوں کی نشاندہی مناسب ہوگی جو راحت القلوب سے ماخوذ اور فوائد الفواد میں منقول ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) خرقۂ معراج	راحت القلوب ص ۳	فوائد الفواد ص ۱۹۶	فارسی مطبوعہ نولکشور
(۲) ترک اوراد	" ۲۲	" ۱۰۰	"
(۳) ہفت منارہ	" ۲۴	" ۱۲۳	"
(۴) فضیلت ماہ صیام	" ۲۶	" ۲۰۹	"
(۵) تحفۂ درود شریف	" ۳۰-۳۱	" ۱۰۷	"
(۶) عطیۂ ناصری	" ۳۱	" ۹۹-۱۴۵	"
(۷) مشارق الانوار	" ۳۲	" ۱۰۳	"
(۸) تذکرۂ شیخ حمویہ	" ۳۳	" ۱۲۹	"

(باقی)

حضرت مسیحؑ کے بعد

نصرانیت کا نیا قالب

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

تیسرا اقنوم نصاریٰ کے نزدیک ان کے عقیدۂ تثلیث کا تیسرا اقنوم روح القدس ہے، اسے وہ اقنوم حیات کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بیٹا (مسیحؑ) باپ (خدا) میں سے عقل کی راہ سے تولد ہوا ہے اور روح القدس باپ اور بیٹے دونوں میں سے "مرضی کی راہ" سے صادر ہوا ہے، باپ اور بیٹے میں جو باہم محبت ہے، یہی محبت روح القدس کہلاتی ہے، گویا روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور صفت محبت ہے، یعنی اس صفت کے ذریعہ خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم مسیحؑ (بیٹے) سے محبت کرتی ہے، اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے، یہ صفت بھی صفت کلام کی طرح ایک جوہری وجود رکھتی ہے، اور باپ بیٹے کی طرح قدیم اور ازلی ہے، عیسائیوں کے عقیدہ کی رو سے حضرت مسیحؑ کو بپتسمہ دیے جانے کے وقت یہی صفت ایک کبوتر کے جسم میں حلول کرکے حضرت مسیحؑ پر نازل ہوئی تھی۔[1]

پاک نوشتوں میں باپ سے قدرت، بیٹے سے دانائی اور روح القدس سے پاکیزگی منسوب ہے اس بنا پر تینوں کے کام اس طرح تقسیم کیے گئے ہیں، باپ کا کام قدرت ہے، یعنی وہ دنیا کو پیدا کرکے

۱؎ متی ۳: ۱۶۔

اس کی حفاظت کرے، بیٹے کا کام دانائی ہے، وہ گناہ سے نجات دلوائے، اور کفارہ بنے اور روح القدس کا کام پاکیزگی ہے، یعنی انسان کے دل کو ایمان کے لیے تیار کرے اور ایمان لانے کے بعد اس پر قائم رکھے،

(مسیحی تعلیم کے جوابات ص ۴۰ و ۲۵)

عقیدۂ تثلیث کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تین ۳ اقنوم یا شخصیتوں پر مشتمل ہے: (۱) خدا کی ذات، جو باپ کہلاتی ہے (۲) اس کی صفت علم و کلام جسے بیٹا کہتے ہیں (۳) اس کی صفت حیات و محبت، جسے روح القدس کہا جاتا ہے، ان تینوں میں سے ہر ایک خدا ہے، لیکن یہ تینوں ملا کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں، اسی لیے نصاریٰ تثلیث کو ماننے کے باوجود اپنے کو موحد ہی کہتے ہیں۔ ایک مشہور عیسائی فاضل الفریڈ۔ ای۔ گاروے لکھتے ہیں:

"یہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی، موحدانہ اور کفارہ پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے، جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعہ پختہ کر دیا گیا ہے۔" (بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مقالہ عیسائیت ج ۳ ص ۵۸۱)

وہ نصرانی مذہب کو مشرکانہ قرار دینے والوں کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"عیسائیوں کے عقیدہ کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خطرناک حد تک تین خداؤں کے عقیدے کے قریب آگیا ہے، لیکن عیسائیت اپنی روح کے اعتبار سے موحد ہے، اور خدا کو ایک کلیسائی عقیدہ کے طور پر سمجھتی ہے۔" (ایضاً)

اس طرح کی توجیہ اور لوگوں نے بھی کی ہے، مگر اوپر تثلیث کی جو تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اس سے اس کا گورکھ دھندا ہونا پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ ایک کا حقیقۃً تین اور تین کا ایک ہونا یا مرکب کا مفرد اور مفرد کا مرکب ہونا کیسے درست ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خود مسیحی حضرات بھی اپنی اس تشریح اور بے جا تاویل سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے، بلکہ وہ اس عقیدہ کے بارے میں ہمیشہ اضطراب و تردد کی کیفیت میں

مبتلا رہے، اور بالآخر یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑاتے ہیں کہ تثلیث کا راز اور نکتہ عقل کی فہم سے بالاتر ہے، حافظ ابن تیمیہؒ ان کی اس توجیہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"جب تثلیث کو عقلاً باطل قرار دیا جاتا ہے تو نصاریٰ منقولات کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ امور و عقائد عقل و قیاس سے ماوراء ہیں، ان میں ایمان و تقلید ہی سے کام لینا چاہیے، اور عقلی حیثیت سے اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، حالانکہ ان کے یہ گڑھے ہوئے عقائد آسمانی کتابوں سے ثابت ہی نہیں ہیں، جو چیز عقلی اعتبار سے محال اور باطل ہوتی ہے، وہ یا تو ناممکن ہوتی ہے، یا اس کے ادراک سے عقل قاصر ہوتی ہے اور وہ اس میں منفی و مثبت کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتی، یہی دوسری چیز انبیاء کی تعلیمات و ارشادات میں ملتی ہے، اور پہلی چیز نہیں ملتی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاءؑ کے کلام میں مخالف عقل کوئی چیز نہیں، البتہ ماورائے عقل چیزیں ہیں، اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔"[1]

لیکن یہ کہنے سے بھی مسیحی علماء کو چھٹی نہ ملی اور وہ خود اپنے افراد اور گروہوں کو بھی تشفی نہ دے سکے، انھوں نے بڑی بڑی کونسلیں اور اجتماعات کیے، مگر یہ عقدہ حل نہ ہو سکا اور ان کے اندر اس مسئلہ میں برابر اختلافات ہوتے رہے، عیسائی مصنفین نے اپنے ایسے متعدد فرقوں اور اشخاص کا ذکر کیا ہے جو تثلیث کو توحید کے ہم آہنگ قرار دینے کی کوششوں پر بے اطمینانی ظاہر کرتے رہے ہیں، ان کے ایک فرقہ ابیونی نے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی مگر مارس ریلٹن کے بیان کے مطابق وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے: حضرت مسیحؑ کو خدا مان کر ہم توحید کے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتے، ہم کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ پورے طور پر خدا نہیں تھے، انھیں خدا کی شبیہ یا اس کے اخلاق کا عکس تو کہا جا سکتا ہے لیکن وہ ویسے ہی ہو بہو خدا نہ تھے جیسے باپ۔

لیکن کلیسا کو یہ توجیہ کب پسند آ سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس فرقہ کو مطعون ہونا پڑا اور وہ ملحد اور

[1] الجواب الصحیح ج ۲ ص ۸۹

بدعتی کہلایا، اس الزام سے بچنے کے لیے خود اسی فرقہ کے بعض صلح پسند اشخاص نے یہ کہا کہ حضرت مسیحؑ کی خدائی کا اس طرح کھلم کھلا انکار مناسب نہیں بلکہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ خدا تھے، البتہ شرک کے الزام سے بچنے کیلیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بالذات خدا نہ تھے بلکہ ان کی خدائی باپ کی عطا کی ہوئی تھی، اس اعتقاد کے ساتھ توحید اس طرح درست ہے کہ بالذات خدا صرف باپ ہے، لیکن تثلیث کا عقیدہ بھی صحیح ہے کیونکہ باپ نے خدائی کے اوصاف بیٹے اور روح القدس کو بھی عطا کر دیے تھے، مگر اس طرح کی تاویل کرنے والے حضرات بھی پادریوں کے نزدیک گمراہ ہی قرار پائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن عیسائی فرقوں اور اشخاص نے تثلیث کی گتھی حل کرنے یا اسے توحید کے مطابق قرار دینے کی کوشش کی، وہ سب ناکام رہے، اور ان میں سے بعض تو سرے سے اس عقیدہ ہی سے بیزار ہو کر توحید کے قائل ہو گئے، یہاں عقیدۂ تثلیث کی مختصر سرگذشت بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے؛

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے حضرت مسیحؑ کو عام طور پر کلام کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا، تاہم بکثرت عیسائی اب بھی ان کی الوہیت کو نہیں مانتے تھے، چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر ایسی سخت بحثیں ہوئیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں، آخر ۳۲۵ء میں نیقیہ کونسل نے الوہیت مسیحؑ کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دے دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب بھی کر دیا گیا[1]، اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک اختلافات ہوتے رہے، لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلہ کو ہوئی ...... اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث مسیحی مذہب کا ایک جزء لاینفک ہو گیا...... سنہ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے مسیح کی ذات کو دو مکمل طبیعتوں کا مجموعہ قرار دیا، ایک الٰہی طبیعت اور دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدیل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں"

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)

---

[1] اسے اس مضمون میں پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ تثلیث کا اصل نصرانی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ حضرت مسیحؑ کے بعد وضع و اختراع کیا گیا ہے اور ۳۲۵ء میں نیقیہ کونسل میں بڑے رد و کد اور کافی بحث و تمحیص کے بعد اسے باقاعدہ عقیدہ کی حیثیت حاصل ہو سکی ہے، لیکن کونسل کی منظوری کے بعد بھی انصاف پسند لوگوں کے اندر اس کے بارہ میں خلش موجود رہی، چنانچہ فرقہ ایریوسی حضرت مسیحؑ کو مخلوق مانتا تھا، اور اس نے تثلیث و حلول کے رد و ابطال میں نمایاں جد و جہد کی، تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے آغاز میں اس کی قوت بہت بڑھ گئی تھی، مگر نیقیہ کونسل کے فیصلہ کے بعد جب نظریۂ تثلیث عیسائیوں کا عام عقیدہ بن گیا تو اس فرقہ کا اثر بھی کم ہو گیا، عیسائیوں کا ایک اور فرقہ یونی ٹیرین بھی توحید کا قائل تھا، اور تیرہویں صدی کے متعدد مسیحی فرقوں نے تثلیث کو لغو اور باطل عقیدہ قرار دیا ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے ان نصرانی علماء کا ذکر کیا ہے جو توحید اور عبدیت مسیحؑ کے قائل تھے، مگر بوجوہ ان کو مسیحی دنیا میں قبول عام نہ ہو سکا، اس سلسلہ میں انھوں نے نصاریٰ کے بعض فرقوں کے نام بھی گنائے ہیں اور ایک نو مسلم نصرانی حسن بن ایوب کا طویل رسالہ بھی نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے اسلام قبول کرنے کے اسباب اور دین اسلام کی ترجیح کے دلائل تفصیل سے نقل کیے ہیں (ملاحظہ ہو الجواب الصحیح جلد دوم آخر و جلد سوم آغاز)

یہ شروع ہی میں واضح کیا جا چکا ہے کہ نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد و اعمال حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت اور اصل انجیل کے سراسر منافی ہیں اور تثلیث کا عقیدہ خود نصاریٰ کی اختراع ہے، موجودہ اناجیل گو محرف اور غیر معتبر ہیں، لیکن پھر بھی ان میں تثلیث کی تردید موجود ہے اور توحید کی تعلیم ان سے محو نہیں ہو سکی ہے، اس کے ثبوت میں اناجیل کے بکثرت حوالے بھی نقل کیے جا چکے ہیں، یہاں اس امر کی جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ متی کی انجیل کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"یسوع مسیح بن داؤد بن ابراہام کا نسب نامہ"

آگے اسی باب میں یہ بھی درج ہے:

"یعقوب سے یوسف پیدا ہوا اور یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے۔"

قابلِ غور یہ ہے کہ جس کا نسب نامہ یہ ہو اور جو پیدا ہوا اور جنا گیا ہے وہ خدا اور غیر مخلوق کیونکر ہو سکتا ہے، اس کے بعد بھی عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ انجیل کو مانتے ہیں، کیسے صحیح ہو سکتا ہے، اگر واقعی وہ انجیل کو مانتے تو حضرت مسیحؑ کو خدا تو نہ کہتے۔

حلول نصاریٰ کے شرک کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیم کو نظر انداز کر کے ان کے حلول و تجسیم کے قائل ہو گئے تھے، سب سے پہلے یوحنا کی انجیل میں تحریف کر کے یہ عقیدہ شامل کیا گیا تھا، ملاحظہ ہو:

"ابتدا میں (مسیح) کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا، اور کلام خدا تھا، یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔" (یوحنا ۱: ۱ و ۲)

نیز:

"اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور راستی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔" (یوحنا ۱: ۱۴)

نصاریٰ کے نزدیک کلام دوسرے اقنوم ابن سے عبارت ہے جو مستقل خدا ہے، اس لیے یوحنا کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفت کلام مجسم ہو کر حضرت مسیحؑ کی صورت میں آ گئی تھی، یعنی مسیحؑ خدا کا کلام تھے، یہی کلام مسیحؑ کے جسم سے متحد ہو گیا، اس طرح لاہوت نے ناسوت کا جامہ پہن لیا، مارس، ریٹن اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیتھولک عقیدے کی رو سے وہ ذات جو خدا تھی خدائی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی، یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کر لیں جو زمان و مکان کی قیود میں مقید ہے، اور ایک عرصہ تک ہمارے درمیان مقیم رہی۔"[1]

---

[1] بحوالہ مقدمہ اظہار الحق ص ۵۹۔

بیٹے کے اقنوم کو یسوع مسیحؑ کے انسانی وجود کے ساتھ متحد کرنے والی قوت عیسائیوں کے نزدیک روح القدس تھی، جس سے مقصود خدا کی صفت محبت ہے، اس لیے اس عقیدہ کا حاصل یہ نکلا کہ چونکہ خدا کو اپنے بندوں سے محبت تھی، اس لیے اس نے اپنی صفت محبت کے ذریعہ اقنوم ابن کو دنیا میں بھیج دیا تھا تاکہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔

بیٹے کے حضرت مسیحؑ میں حلول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹا خدائی چھوڑ کر انسان بن گیا، بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ پہلے صرف خدا تھا، اب انسان بھی ہو گیا، لہٰذا حضرت مسیحؑ بیک وقت خدا بھی تھے، اور انسان بھی، الفریڈ۔ ای، گارڈ لکھتا ہے:

"حضرت مسیحؑ حقیقۃً خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے۔۔۔۔ منظور شدہ فارمولا یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ایک شخصیت میں دو ماہیتیں جمع ہو گئی تھیں۔"[1]

حضرت مسیحؑ بہ حیثیت انسان خدا سے کمتر تھے، لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ ہی کے برابر ہیں، اگسٹائن لکھتا ہے:

"خدائی حیثیت سے، انھوں نے انسان کو پیدا کیا، اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیے گئے۔"[2]

تثلیث ہی کی طرح عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی ہمیشہ معمہ بنا رہا، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی شخص خدا بھی ہو، اور انسان بھی، خالق بھی ہو اور مخلوق بھی، اعلیٰ و افضل بھی ہو اور ادنیٰ و اسفل بھی، چنانچہ تثلیث کی طرح اس عقیدہ پر بھی برابر بحث و تمحیص ہوتی رہی اور مسیحی علماء نہ تو خود اس پر مطمئن ہو سکے اور نہ دوسروں کو مطمئن کر سکے، عام طور سے اسے نقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، اسی لیے رومن کیتھولک چرچ نے اس کو ثابت کرنے کے لیے اکثر یوحنا کی عبارتوں سے استدلال کیا ہے، حالانکہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ اصل انجیل ان بدعات

---

[1] بحوالہ مقدمہ اظہار الحق ص ۶۰ [2] ایضاً۔

عقائد سے یکسر پاک تھی۔

عقیدۂ حلول کو عقلی اور انسانی سمجھ سے قریب کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ سب عجیب و غریب اور بالکل ہی ناقابل فہم ہیں، اس لیے ہم ان کو نظر انداز کر کے صرف ان تعبیروں اور تشریحوں کو نقل کرتے ہیں جو نصاریٰ کے مختلف گروہوں اور جماعتوں نے عقیدۂ حلول کی پیش کی ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ خود نصاریٰ بھی اپنے اس عقیدہ کی بنا پر کس قدر خلش و اضطراب میں مبتلا رہے۔

نصاریٰ کی ایک جماعت کے نزدیک حضرت مسیح کو خدا ماننا صحیح نہیں، وہ صرف انسان تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیح کے وجود میں خدا کے حلول کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو خدا کی جانب سے ایک خاص عقل و دانائی بخشی گئی تھی۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان میں خدا کی صفت علم حلول کر گئی تھی، لیکن اس کی وجہ سے ان کو خدا، خالق، قدیم اور ازلی کہنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ حلول کے باوجود خدا بدستور خالق اور حضرت مسیح بدستور مخلوق رہے۔

چوتھی صدی عیسوی میں آریوس نے اپنے وقت کے کلیسا کے خلاف بڑی زبردست مہم چلائی، اس نے یہ کہہ کر عیسائی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی کہ خدا قدیم، ازلی اور وحدہٗ لاشریک ہے، اسی نے بیٹے کو پیدا کیا، وہ پہلے معدوم تھا، اس لیے بیٹا نہ ازلی ہے اور نہ خدا، ہمیشہ سے صرف باپ ہے، کیونکہ ایک ایسا وقت بھی تھا جس میں بیٹا موجود نہیں تھا، وہ باپ سے الگ ایک مستقل حقیقت رکھتا ہے اور اس پر حوادث و تغیرات واقع ہو سکتے ہیں، وہ حقیقۃً خدا نہیں ہے، البتہ اس میں مکمل ہونے کی صلاحیت ہے، اور وہ ایک مکمل مخلوق نیز ایک عقل مجسم ہے جو ایک حقیقی انسانی جسم میں پائی جاتی ہے، گو آریوس کے نظریات مقبول ہوئے مگر نیقیہ کونسل میں ان کی پرزور تردید کی گئی اور وہ جلاوطن کر دیا گیا۔

پانچویں صدی میں پولسی فرقہ نے حضرت مسیح کو خدا کے بجائے فرشتہ قرار دیا جو دنیا میں لوگوں کی

اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے، اور حضرت مریم کے بطن سے انسان کی شکل و صورت میں پیدا کیے گئے تھے، چونکہ خدا نے انھیں اپنا مخصوص جلال عطا کیا تھا اس لیے وہ خدا کے بیٹے کہلائے، لیکن یہ نظریہ مقبول نہیں ہو سکا۔

نسطوری فرقہ کہتا ہے کہ عقیدۂ حلول پر اس لیے اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو ایک شخصیت قرار دے کر ان کے لیے دو حقیقتیں ثابت کی گئی ہیں، ایک انسانی اور ایک خدائی، اس کا حل یہ ہے کہ گو حضرت مسیح کا خدا ہونا بھی درست ہے اور انسان ہونا بھی بجا ہے، لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ ان کی ایک شخصیت کے اندر یہ دونوں حقیقتیں جمع ہو گئی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ دو شخصیتوں کے جامع تھے، ایک بیٹا اور ایک مسیح، ایک ابن اللہ اور ایک ابن آدم، بیٹا خالص خدا ہے اور مسیح خالص انسان۔

نسطوریوں کی یہ تعبیر رومن کیتھولک چرچ کی اس تعبیر کے خلاف ہے جو حضرت مسیح کو ایک شخصیت اور دو حقیقتیں مانتی ہے، ۴۳۱ء میں افسس میں سارے کلیساؤں کی ایک کونسل نے اس نقطۂ نظر کو باطل قرار دے کر نسطوریوں کو قید اور جلاوطنی کی سزا دی اور اس کے متبعین کو بدعتی قرار دیا، مگر یہ فرقہ اب تک موجود ہے۔

چھٹی صدی میں یعقوبی فرقہ کا ظہور ہوا، اس کے بانی یعقوب نے کہا کہ حضرت مسیح کی ایک ہی شخصیت تھی اور ان میں حقیقت بھی صرف ایک ہی پائی جاتی تھی اور وہ تھی خدائی، وہ صرف خدا تھے گو انسان کی شکل میں نظر آتے تھے، رجعت پسند طبقہ نے اس توجیہ کو بدعت قرار دیا، لیکن ساتویں صدی تک اس عقیدہ کا بڑا چرچا رہا اور اب بھی اس فرقہ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ گو حضرت مسیح کی ایک ہی شخصیت میں خدائی اور انسانیت دونوں حقیقتیں جمع تھیں تاہم وہ خدائی انسانیت تھی، آدمیوں کی انسانیت نہ تھی، اس لیے

ان کی ذات میں الہ دونوں کے بیک وقت پائے جانے میں کوئی اشکال نہیں[1]۔

غرض جتنے متضاد اتنی باتیں تھیں لیکن اسکے باوجود اسے قرین قیاس اور مطابق عقل کہنا محال ہے، یہی وجہ ہے کہ تثلیث کی طرح حلول کا عقیدہ بھی ہمیشہ الجھا اور پیچیدہ بنا رہا، اور بالآخر یہ کہہ کر دونوں کو چپ کرنے کی کوشش کی گئی کہ "عقیدۂ حلول ایک سربستہ راز ہے، اسے ماننا ضروری ہے، مگر سمجھنا ممکن نہیں"۔

قرآن مجید اور عقیدۂ تثلیث و حلول

قرآن مجید نے تثلیث و حلول کے نصرانی عقائد کو صریح شرک و کفر قرار دے کر ان کی مدلل تردید کی ہے، اس کی کئی سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے، سورۂ آل عمران کے اصل مخاطب نصاریٰ ہیں اور اس کا بنیادی مضمون اسلام ہے، جس کی حقیقت نصاریٰ نے مسخ اور گڈمڈ کر دی تھی، نیز انھوں نے اسلام کو تثلیث اور حلول کے ناقابل فہم عقیدوں میں گم کر دیا تھا، اور اس کے اندر اپنی طبیعت سے نئی نئی باتیں شامل کر دی تھیں، سورۂ آل عمران میں اسلام کی اصل حقیقت کو واضح کرنے کے علاوہ نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد، بدعات اور دین میں ان کے اضافوں کی تردید کی گئی ہے، حضرت مسیحؑ کے ذکر کی تقریب و تمہید کے لیے پہلے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آل ابراہیم اور آل عمران کا ذکر ہوا ہے، جن کو خدا نے دنیا کی ہدایت و امامت کے لیے مامور کیا تھا، اس سلسلہ میں آل عمران کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ حضرت مریمؑ اسی مبارک خانوادہ سے تعلق رکھتی تھیں، اور انبیاء کا شجرہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مریمؑ اور مسیحؑ کی عظمت و بزرگی اس سلسلۂ رشد و ہدایت سے جڑی ہوئی ہے جو اللہ نے دنیا کے لیے جاری کیا تھا، ورنہ یہ دونوں مافوق البشر نہ تھے، بلکہ اللہ کے دوسرے منتخب اور برگزیدہ بندوں کی طرح یہ بھی اس کے برگزیدہ بندے تھے، انھوں نے خود بھی اللہ کی اطاعت و بندگی کی اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دی، ایسی صورت میں خدا کے ان بندوں کو معبود اور الہ بنانا

---

[1] الملل والنحل ابن حزم و شہرستانی کے شروع کی دونوں جلدوں کے مختلف حصوں میں یہ تفصیلات موجود ہیں۔

کسی طرح بھی روا اور مناسب نہیں ہے۔

قرآن کے نزدیک حضرت مسیحؑ کو الہ یا خدا کا بیٹا بنانا نصاریٰ کی اپنی ایجاد و اختراع ہے، اس کے لیے ان کے پاس کوئی سند اور ثبوت نہیں، فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَ	اور یہود نے کہا عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور
قَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ	نصاریٰ نے کہا مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں یہ ان کے
ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ	منہ کی باتیں ہیں، ان سے پہلے کے کافر بھی اسی
قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ	طرح کی باتیں کہا کرتے تھے، یہ بھی انہی کی ریس
اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ۔	کرنے لگے ہیں، خدا ان کو ہلاک کرے یہ کہاں
(توبہ: ۳۰)	پھیرے جا رہے ہیں۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہنا نہایت لغو اور بے تکی بات ہے، جو کافروں کی باتوں سے ملتی جلتی ہوئی ہے، خدا نے ہرگز ایسی بات نہیں کہی ہے بلکہ یہ خود نصاریٰ کی اپنی ایجاد اور بدعت ہے وہ اس کی کتاب سے اس کی کوئی سند نہیں پیش کر سکتے، دوسری آیتوں میں نہایت صراحت سے اس شرک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ	بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے
الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ	کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے، حالانکہ
يٰبَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي	خود مسیحؑ کا قول یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل
وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ	اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور
فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ	تمہارا بھی رب ہے، جو کوئی اللہ کا شریک
وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ	ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام

مِنْ اَنْصَارٍ، لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ
قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا
مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ .....
مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ
وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ
الطَّعَامَ۔ (مائدہ: ۷۲-۷۵)

کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے
اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور
ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنھوں نے کہا کہ
اللہ تین کا تیسرا ہے، حالانکہ نہیں ہے
کوئی معبود مگر ایک ہی معبود ... مسیح بن مریم
تو بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے
رسول گذرے ہیں، اور اُن کی ماں ایک
صداقت شعار بندی تھیں، یہ دونوں کھانا
کھاتے تھے۔

ان آیتوں میں حلول و تثلیث دونوں کو کفر قرار دے کر ان کی تردید کے لیے خود حضرت مسیحؑ کا قول نقل کیا ہے کہ میرے اور اپنے خداوند کی عبادت کرو، اس سے ظاہر ہوا کہ وہ خود الٰہ و معبود نہ تھے، ان کو جو کچھ عظمت و بزرگی حاصل ہوئی تھی وہ محض رسول ہونے کی بنا پر ہوئی تھی، پھر حضرت مسیحؑ کی عدم الوہیت اور بشریت ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ وہ اور ان کی والدہ ماجدہ کھانا کھاتی تھیں، کیونکہ کھانا کھانا بشریت کی واضح دلیل ہے، جس طرح ہر آدمی اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے دانہ پانی کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح یہ دونوں ماں بیٹے بھی ان کے محتاج تھے، ایسی صورت میں بھلا وہ معبود کس طرح ہو سکتے تھے۔

اسی سورہ میں یہ آیت بھی ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ

بیشک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ اللہ تو وہی
مسیح بن مریم ہے، پوچھو کون اللہ کے کچھ اختیار رکھتا ہے اگر

مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا، اِنْ اَرَادَ اَنْ
يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا، وَلِلّٰهِ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا، يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ، وَاللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ: ۱۷)

وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح بن مریم کو،
اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو،
اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین
اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی
بادشاہی، وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے
اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں الوہیتِ مسیحؑ کو باطل کرنے کے لیے ان کی بے بسی اور اپنے اختیار کلی کا ذکر کیا ہے، حضرت مسیحؑ کی الوہیت کی سب سے بڑی اور اہم وجہ ان کی خارق عادت پیدائش کو سمجھا جاتا ہے، اسی کی تردید کے لیے خدا نے اپنی بادشاہی اور ہر چیز پر قدرت کی صراحت کی ہے، اسی بنا پر بعض آیتوں میں حضرت مسیحؑ کی مثال حضرت آدمؑ سے دے کر بھی الوہیتِ مسیحؑ کے عقیدہ کو باطل قرار دیا گیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ
اٰدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (آل عمران ۵۹)

عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے،
اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا
تو وہ ہو گیا۔

جس طرح حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے اور اللہ کے کلمۂ کُنْ سے ان کا وجود ہوا تھا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کلمۂ کُنْ سے ہوئی تھی، اگر باپ کے بغیر پیدا ہونا الوہیتِ مسیحؑ کی دلیل ہے تو حضرت آدمؑ تو بدرجۂ اولیٰ الٰہ بنائے جانے کے مستحق ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش باپ اور ماں دونوں ہی کے بغیر ہو گئی تھی۔

قرآن میں بعض جگہ حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ ہی حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر بھی اسی لیے

آیا ہے کہ اگر عام طریقہ کے برخلاف کسی کا پیدا ہونا الوہیت کا ثبوت ہے تو حضرت یحییٰؑ کی ولادت بھی غیر عادی طریقہ پر ہوئی تھی، کیونکہ وہ حضرت زکریاؑ کی پیری اور ان کی بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود اللہ کی مشیت سے پیدا ہو گئے تھے، اس لیے اگر حضرت یحییٰؑ کو ان کی خارق عادت ولادت کے باوجود اللہ نہیں مانا جاتا تو حضرت مسیحؑ کو کیوں اللہ مانا جائے۔

قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا ذکر ایک معجزہ کی حیثیت سے کیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ	اور اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو جب
انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا	وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرق کی طرف
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا	چلی گئیں تو انھوں نے ان کی طرف سے پردہ
مَسْتُورًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا	کر لیا، اس وقت ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ	بھیجا تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی (کی
إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ	شکل میں) بن گیا، مریم بولیں کہ اگر تم پرہیزگار
تَقِيًّا قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ	ہو تو میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں انھوں نے
لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا قَالَتْ	کہا کہ میں تو تمھارے پروردگار کا بھیجا ہوا
أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي	(یعنی فرشتہ) ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ
بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا قَالَ كَذٰلِكِ	تمھیں پاکیزہ لڑکا بخشوں، مریمؑ نے کہا کہ میرے
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ	ہاں لڑکا کیونکر ہوگا مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں
آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا	اور میں بدکار بھی نہیں ہوں (فرشتے نے) کہا کہ
مَقْضِيًّا فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ	یوں ہی ہوگا، تمھارے خدا نے فرمایا کہ یہ مجھے
مَكَانًا قَصِيًّا	آسان ہے اور (اس طرح پیدا کرکے) میں

اسے لوگوں کے لیے اپنی طرف سے نشان بناؤ
اور ذریعۂ رحمت بھی، اور یہ کام طے شدہ ہے،
تو وہ اس بچے کے ساتھ حاملہ ہو گئیں اور اسے
لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں۔ (مریم: ۱۶ - ۲۲)

پھر اس کے بعد ولادت اور گہوارہ کے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کی ایک مجسم نشانی تھے، اور ان کی پیدائش ہی نہیں بلکہ ان کا سراپا وجود خدا کا معجزہ تھا اور اس طرح کے معجزات کا صدور اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، اصل چیز اس کا حکم اور فیصلہ ہے، ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ہو جانے کا حکم دیتا ہے، اور وہ ہو جاتا ہے، حضرت آدمؑ و حواؑ اور تمام فرشتے بھی اسی طرح بلا ماں باپ کے خدا کے فیصلہ کے مطابق پیدا ہوئے تھے، اس بنا پر حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا، اس کا مظہر یا اوتار نہیں مانا جاسکتا۔

قرآن کے مقابلہ میں انجیل کا حال یہ ہے کہ مرقس اور یوحنا نے تو اس عظیم الشان واقعہ کا سرے ذکر ہی نہیں کیا ہے، البتہ متی اور لوقا نے اس کا ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو متی ۱ : ۱۸ - ۲۱ و لوقا ۱ : ۲۶ - ۳۵) ان دونوں کے بیان میں اولاً تو تضاد ہے، ثانیاً انھوں نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے اس عظیم الشان واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے جس سے وہ ایک دیومالائی قصہ اور افسانہ معلوم ہوتا ہے، آگے بتایا جائے گا کہ نصاریٰ کا مذہب رومی و یونانی بت پرستوں کی نقالی و تقلید کے علاوہ ان کے توہمات پر مبنی ہے، حضرت مسیحؑ کی ولادت کے واقعہ میں بھی ان ہی قوموں کے توہم پرستانہ خیالات شامل کر لیے گئے ہیں، کیونکہ ان کے یہاں بھی متعدد بزرگوں کی ولادت کے سلسلہ میں اسی طرح کی توہم پرستانہ روایات مشہور ہیں، جن کو نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ پر بھی چسپاں کر دینے کی کوشش کی ہے ڈریپر لکھتے ہیں:

"جب ایران پر آخری حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر جوپٹیر ایمن دیوتا کے مندر کی یاترا کو روانہ ہوا، جو دو سو میل کے فاصلہ پر صحرائے لیبیا کے ایک خوش سواد مرغزار میں واقع تھا، مندر کے غیب داں کاہن نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ تم اسی ہیکل دیوتا کی اولاد ہو جو سانپ کی شکل اختیار کر کے تمھاری ماں اولمپیاس کو اپنے تصرف میں لایا تھا، یہ خیال کہ بے باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور یہ نتیجہ دیوتاؤں اور ان عورتوں کی مواصلت سے مترتب ہوتا ہے جو ان کی منظور نظر ہوں، اس زمانہ میں اس قدر عام تھا کہ جو شخص اپنے اقران و اماثل میں غیر معمولی طور پر نمایاں اور سر برآوردہ ہوتا تھا آسمانی نسل سے سمجھا جاتا تھا، اس قسم کے خیالات صدہا سال تک لوگوں میں پھیلے رہے، چنانچہ رومۃ الکبریٰ کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک کنواری لڑکی رہی سلویا نامی گھڑا لیے ہوئے پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر جا رہی تھی کہ مارس دیوتا کی اس پر نظر پڑ گئی، دیوتا اس دوشیزہ پر عاشق ہو گیا، اور اس تعشق کا نتیجہ رومیولس ہوا جس نے شہر روما کی بنا ڈالی، اگر کوئی شخص اس روایت کے صحیح ہونے میں شک لاتا تو خدا جانے اس کی کیا گت بنتی، خود افلاطون کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس کی ماں پیرکیٹونی کنواری تھی، جسے اپالو دیوتا سے حمل رہ گیا تھا اور دیوتا نے ارسٹان کو جس کے ساتھ پیرکیٹونی کی نسبت ٹھہری تھی افلاطون کے آسمانی نسب کا حال بتا دیا تھا، بانیٔ فلسفۂ اشراقیہ کے مصری تلامذہ کے سامنے اگر کوئی شخص اس کی ابوت کے سماوی الاصل ہونے کے متعلق شبہہ ظاہر کرتا تو ان کی ناراضی کی کوئی انتہا نہ رہتی' شاہ اسکندر بن جوپٹیر ایمن کے القاب کے ساتھ جب سکندر کے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے تو شام اور مصر کے باشندے انھیں اس انتہائے تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا آج کل صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے، لیکن آزاد خیال یونانی اس آسمانی نسبت کی اصل قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھے، اولمپیاس جس سے زیادہ روشنی اس معاملہ پر اور کوئی نہ ڈال سکتا تھا' ازراہِ مزاح کہا کرتی تھی کہ بہتر ہو اگر اسکندر مجھے اس فضیلت سے معاف رکھے، تا کہ جوپٹیر کی بی بی کے ہر دتت کے

رقیبانہ طیش و غضب سے تو بچی رہوں[1]۔"

پروفیسر نواب علی نے ان واقعات کو ذکر کرنے کے بعد مہابھارت سے بھی اسی طرح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

"ایک راجہ کی کنواری لڑکی کو رشیوں نے اس کے حسن خدمات کے عوض چند ایسے منتر سکھا دیے تھے جن کو پڑھ کر وہ جس آسمانی دیوتا کو چاہے بلا سکتی تھی، ایک دن اس لڑکی نے آزمانے کی غرض سے سوریا دیوتا کیلئے منتر پڑھا، فوراً دیوتا ایک جوان خوشرو کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے موجود ہوا اور کہنے لگا 'مجھے کیوں تکلیف دی ہے؟' لڑکی نے کہا 'میں نے تو محض آزمایش کے طور پر منتر پڑھا تھا' دیوتا نے کہا: 'یہ نہیں ہو سکتا' اب میں آیا ہوں تو اپنی ایک یادگار بھی چھوڑتا جاؤں' لڑکی جھجکی اور کہنے لگی کہ دیوتا میں بدنام ہو جاؤں گی' دیوتا نے جواب دیا: 'نازنین! تو ڈرتی کیوں ہے' اس حمل کے رہ جانے سے تیری بکارت زائل نہ ہونے پائیگی' غرض کہ اس طور سے کرن پیدا ہوا، یہ وہی مشہور سورما کرن ہے جو مہابھارت کی جنگ میں پانڈوں سے لڑا اور آخر میں ارجن کے ہاتھ سے مارا گیا' اور یہ لڑکی پانچوں پانڈوں کی ماں کنتی ہے۔"

تاریخ حبیب السیر میں خانخانان مغول کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک خان کی ماہ پیکر دختر آلانقوا ایک رات اپنے خیمہ میں سو رہی تھی، ناگاہ روزن خیمہ سے ایک روشنی داخل ہوئی اور اس کے ذہن میں نفوذ کر گئی جس سے وہ نور اُحاملہ ہو گئی، چنگیز اور تیمور کے اجداد اسی "نورانی حمل" کی یادگار ہیں، نعوذ باللہ من ہفواتہم[2]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصاریٰ نے بھی ان اقوام کی طرح حضرت مسیحؑ کی مافوق العادت ولادت کو افسانوی رنگ دے کر انھیں خدا اور مظہر خدا کہنا شروع کیا ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ خود تثلیث، حلول اور تجسیم کے مشرکانہ عقائد

[1] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۱۲ و ۱۳۔ [2] تاریخ صحف سماوی ص ۸۰۔

دوسری قوموں میں بھی پائے جاتے رہے ہیں، پیروانِ مسیحؑ ان ہی کی تقلید و اتباع میں تثلیث اور حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے گمراہ کن عقیدے میں پڑ گئے تھے، مصر کے ایک قبطی النسل عالم و محقق مجدی مرجان نے ایک کتاب "اللہ واحد ام ثالوث" (اللہ ایک ہے یا تین کا مجموعہ دم کب) کے نام سے لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"بت پرست مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ثالوث مقدس کا عقیدہ ان سب کے اصول وعقائد کا ایک اہم جز رہا ہے، اس کو قدیم مصری، ہندو اور دوسری بہت سی بت پرست قومیں مانتی رہی ہیں[1]۔

ہندوؤں کے یہاں اوتار کا عقیدہ حضرت مسیحؑ سے صدیوں قبل سے چلا آرہا ہے، اور بعض مصنفین نے ہندوؤں کی تثلیث اور نصاریٰ کی تثلیث کی مشابہت و مماثلت کا ذکر کیا ہے، ہندو برہما، وشنو اور شیو کو ایک الٰہ کے تین رخ سمجھتے تھے اور برہما کو ایسا وجود مانتے تھے جو تین اقانیم کا مجموعہ تھا، اہل مصر بھی قدیم زمانہ سے متعدد معبودوں کے قائل رہے ہیں، اسکندریہ جس زمانہ میں مصریوں کا دینی مرکز تھا اسی زمانہ میں بطلیموس اول نے ایک بڑا معبد تعمیر کرایا تھا، اس میں ثالوث کی پرستش کی جاتی تھی، یہ تین معبودوں کا مجموعہ تھا، اور لوگ ان تینوں کو الگ الگ رب ماننے کے بجائے انھیں ایک الٰہ کے تین رخ سمجھتے تھے[2]، مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم لکھتے ہیں:

"مصری شرک یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، یونان کے بڑے سے بڑے فلسفی اسکندریہ کے 'مرکز عقلیت' و 'روشن خیالی' سے مرعوب و متاثر تھے، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم جب شروع میں پھیلی تو انہی یونانیوں میں اکابر یہود مثلاً (فائیلو[3]) پہلے ہی سے یونانیوں کے آگے گھٹنے جھکا چکے اور ان سے (Logos) وغیرہ کے عقائد اخذ کر چکے تھے، مسیحیوں نے ان تعلیمات کو بلا تامل قبول کر لیا اور پھر

---

[1] الوعی الاسلامی، کویت [2] ایضاً [3] یہ ایک یہودی فلاسفر کا نام ہے جو حضرت مسیحؑ کا معاصر تھا۔

پولوس (سینٹ پال) نے تو حضرت مسیحؑ کے مذہب اور تعلیم کو تمامتر مسخ کر کے اسے یونانی شرک کی ایک شاخ بنا دیا، آخر میں رہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی، موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری، یونانی اور رومی شرک ہی کا ایک مخلوطہ ہیں ..... اللہ کے بھیجے ہوؤں کو اس کے نائبوں اور رسولوں کو خود معبود سمجھ بیٹھنے کا مرض مشرک قوموں میں عام رہا ہے، مسیحیوں نے بھی مصری، یونانی، رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیغمبر برحق کو بھی مظہر خدا یا فرزند خدا کا درجہ دے دیا تھا ..... ثنویت، تثلیث اور شرک مطلق کے عقیدے بہت قدیم ہی نہیں، بلکہ یونان، ایران، مصر، ہند، عراق، چین وغیرہ دنیا کے اکثر ملکوں میں شائع رہ چکے ہیں"

(تفسیر ماجدی ج ۲، ص ۲۹۷ و ۴۷۲)

قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصاریٰ دوسری قوموں سے متاثر ہو کر شرک کی خباثت میں ملوث ہوئے تھے ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا	اے پیغمبر! کہدو کہ اے اہل کتاب اپنے
فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا	دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی
أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ	بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے
وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ	گمراہ ہوئے، اور جنھوں نے بہتوں کو گمراہ
سَوَاءِ السَّبِيلِ ۔ (مائدہ ۷۷)	کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔

اس آیت کے اصل مخاطب نصاریٰ ہیں، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی اور بدعقیدگی گمراہ اور بت پرست قوموں کی نقالی اور تقلید کا نتیجہ تھی، انھوں نے نصرانیت میں بت پرست قوموں سے شرک و کفر لے کر شامل کر دیا تھا۔

علماء و مشائخ کو رب بنالینا | اوپر جو قرآنی آیتیں نقل کی گئی ہیں، ان میں نصاریٰ کے عقیدۂ حلول و تثلیث اور

الوہیت مسیحؑ کا ذکر تھا، مندرجۂ ذیل آیت میں ان کے ایک اور شرک کی صراحت کی گئی ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ	مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا رب بنالیا،
ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا	حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد
لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا سُبْحٰنَهٗ	کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ.	کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شرک سے
(توبہ: ۳۱)	پاک ہے۔

علماء و مشائخ کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا تھا اگر انھیں یہ دینی پیشوا حرام قرار دے دیتے تھے تو نصاریٰ بھی انھیں حرام سمجھنے لگتے تھے، اسی طرح جو چیزیں خدا نے حرام کی تھیں انھیں علماء و مشائخ کے حلال کر دینے کی وجہ سے حلال خیال کرنے لگتے تھے، قرآن نے ان کے اس طرز عمل کو بھی شرک قرار دیا، اس آیت پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جو نوٹ تحریر فرمایا ہے وہ قابل مطالعہ ہے، لکھتے ہیں:

"اس آیت میں اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہود و نصاریٰ کی تمام فکری و عملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی، یعنی انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو پروردگار بنالیا ہے، پروردگار بنالینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انھیں رب السموات والارض کہتے ہیں، کیونکہ اس طرح تو کبھی کسی نے کسی کو رب نہیں بنایا، مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے فقیہوں کو اور عیسائیوں نے اپنے پوپ اور ان کے مقرر کیے ہوئے پادریوں کو دین کے بارے میں جو منصب دے دیا ہے اور وہ اپنے زاہدوں اور درویشوں کی نسبت جیسا کچھ اعتقاد رکھتے ہیں، وہ فی الحقیقت انھیں مثل پروردگار کے بنالینا ہے، چنانچہ خود پیغمبر اسلام نے اس کا یہی مطلب قرار دیا، عدی بن حاتم جو پہلے عیسائی تھے کہتے ہیں

آنحضرت ﷺ نے جب براءت کی یہ آیت پڑھی تو میں نے عرض کیا: ہم انھیں پوجتے نہیں، آپ نے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرا دیتے ہیں تم حرام سمجھ لیتے ہو اور جس بات کو حلال کر دیتے ہیں حلال مان لیتے ہو، عرض کیا ہاں! فرمایا: یہی ان کو پوجنا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے دینی پیشواؤں کو تشریع دینی کا حق دے دینا کہ وہ جو کچھ اپنی خواہش اور رائے سے ٹھہرا دیں اس کی بلا چون و چرا تقلید و اطاعت کرنی چاہیے، قرآن کے نزدیک انھیں رب بنالینا ہے، کیونکہ اس بات کا حق اللہ کے سوا اور اللہ کی وحی کے مبلغ کے سوا اور کسی کو نہیں، پس جب دوسروں کو بھی یہ حق دے دیا گیا تو گویا وہ خدائی میں شریک کر لیے گئے۔" (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۳۴)

جب علماء و مشائخ اور راہبوں اور درویشوں کو یہ کلی اختیار اور کھلی چھوٹ دے دی گئی کہ وہ خدا کی کتابوں اور اس کے احکام و شرائع میں جو اور جس طرح کا بھی چاہیں رد و بدل کر دیں، یہاں تک کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، تو اس کا لازمی نتیجہ نکلا کہ نصاریٰ کا دین بازیچۂ اطفال بن گیا، اور وہ حلول و تثلیث جیسے گمراہ کن مشرکانہ عقائد کا مجموعہ بن گیا، حافظ ابن تیمیہؒ نے جابجا نصاریٰ کی اس کھلی ہوئی گمراہی کا ذکر کیا ہے، اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"نصاریٰ نے اپنے اکابر کے لیے یہ بات جائز قرار دے رکھی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت و قانون کو اپنی رائے سے منسوخ اور تبدیل کر دیں، حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے علماء و فقہاء ان کے لیے عقائد و شرائع وضع کرتے تھے، شہنشاہ قسطنطین کے زمانہ میں مسیحی کونسل میں متفقہ طور پر پوپ کو یہ اختیار دیا گیا تھا، اریوس وغیرہ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی، مگر وہ ملعون قرار دیے گئے، حالانکہ اس کونسل میں جو باتیں طے ہوئی تھیں وہ نہ صرف کتب الٰہی بلکہ عقل صریح کے بھی سراسر خلاف تھیں۔

نصاریٰ کے موجودہ دینی احکام و قوانین میں بعض تو واقعی انبیاء علیہم السلام سے منقول ہیں اور بعض حضرت مسیحؑ کے حواریوں کے ارشادات ہیں، مگر اکثر چیزیں ان کے علماء و مشائخ کے

اضافے اور بدعتیں ہیں اور وہ انبیاء کی تعلیم و شریعت کے سراسر خلاف ہیں، اس طرح ان کا دین بھی یہودیوں کے دین کی طرح حق و باطل کا ملغوبہ ہے[1] ..... نصاریٰ اپنے اکابر و مشایخ کیلئے یہ روا سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی اس شریعت میں ترمیم و تنسیخ کر دیں جس کو دے کر اس نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا، چنانچہ یہ مشایخ ان چیزوں کو حلال کر دیتے ہیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا تھا جیسے انھوں نے سور اور دوسری ناپاک چیزوں کو حلال کر دیا، نیز ان کے نزدیک خبائث سرے سے حرام ہی نہیں رہے اسی طرح خدا نے جن چیزوں کو حلال کیا تھا، انھیں حرام کر دیتے تھے، جیسے رہبانیت کو انھوں نے خود گڑھ لیا تھا اور خدا کی حلال کردہ طیبات کو حرام بنا دیا تھا، علاوہ ازیں لازمی اور ضروری چیزوں کو خدا کی شریعت سے خارج اور ساقط کر دیا تھا، جیسے ختنہ، غسل، طہارت اور نجاست وغیرہ کے ضروری احکام کو دین سے الفط کر دیا تھا اور جن چیزوں کو خود خدا نے ساقط کیا تھا، انھیں اپنے لیے لازمی اور ضروری کر لیا، اس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے اوپر ایسے احکام و قوانین تھوپ لیے جن کو اللہ اور اس کے نبیوں نے ضروری نہیں کیا تھا[2]۔"

ان مشرکانہ عقائد کی بنا پر نصاریٰ کے مذہب میں مختلف قسم کی رسمیں اور ضعیف الاعتقادی وغیرہ شامل ہو گئی تھیں مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدیؑ تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے، وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے، مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل مصر کو قابو میں کرنے کے لیے کی گئی جس سے حضرت مسیحؑ کی "وہی ایک ہے" کی تعلیم ہمیشہ کیلیے ان کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ج ۱ ص ۱۱۸ و ۱۱۹ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۵۰

پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے، ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے، مسیحؑ و مریمؑ، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ ابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۴ ص ۲۲۵، بحوالہ سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ)

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نصاریٰ کی تاریخ دین میں نئے اضافوں اور بدعتوں سے بھری ہوئی ہے، گذشتہ عقائد و احکام سے انحراف کر کے ان میں حذف و اضافہ اور اصلاح و ترمیم کرنا ان کا روز مرہ کا معمول بن گیا تھا، شروع ہی سے ان کے بنیادی عقائد میں کتر بیونت ہوتی رہی ہے، اور احکام و قوانین میں تبدیل و تنسیخ کا عمل بھی مستقل جاری رہا ہے، کل تک جو چیز حرام تھی آج اسے جائز کر لیا گیا اور کل جو جائز تھا، آج وہی ناجائز ہو گیا، ابتدا میں تین اقانیم کا تصور ایجاد ہوا، آگے چل کر حضرت مریمؑ کو بھی چوتھے اقنوم کی حیثیت حاصل ہو گئی، پھر ان کے رفع جسمانی کا عقیدہ بھی وضع کر لیا گیا اور اس کو ماننا بھی نجات کے لیے ضروری قرار دیا گیا، اس طرح جن عقائد کو وہ اس وقت مان رہے ہیں اور جن احکام و عبادات پر عمل پیرا ہیں ان میں یہ امتیاز کرنا اور پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ کون کون چیزیں حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات پر مبنی ہیں اور کون سی چیزیں حواریوں کے ارشادات ہیں اور کون سی باتیں خود ان کی یا ان کے علماء و فقہاء کے خودساختہ نظریات ہیں۔

(باقی)

نقیبِ حرکت و زندگی "میرزا عبدالقادر بیدلؔ"

از ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ

(ریڈر و صدر شعبۂ اردو و فارسی جین کالج، آرہ)

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست ما زندہ از آنیم کہ آرام نگیریم

میرزا عبدالقادر بیدلؔ ہندوستان کی اس عظیم عبقری شخصیت کا نام ہے جن کی نسبتِ وطنیت پر اہلِ عظیم آباد کا سر ہمیشہ فخر سے اونچا رہے گا، محققین کو بیدلؔ کے عظیم آبادی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا، مگر عظیم آباد ان کا مولد و وطن نہ تھا، اس کی دلیل بھی وہ آج تک فراہم نہ کر سکے، بہر حال اب تک کی معلومات سے یہ واضح ہے کہ میرزا عبدالقادر مغلوں کے مشہور قبیلۂ برلاس کے ایک فرد تھے، ان کے آبا تورانی ماوراء النہر سے منتقل ہو کر بخارا میں آباد ہو گئے، اور کئی پشت اوپر سے سپہگری ان کا پیشہ تھا، میرزا عبدالقادر کے والد میرزا عبدالخالق مغل فوج میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، مگر عین جوانی میں دنیا سے دل پھر گیا اور تصوف کی راہ اختیار کرلی، وہ ہندوستان میں مولانا کمال رانی ساگری کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے، ایامِ کہولت میں بعہد شاہجہانی ۱۰۵۴ھ میں ان کے گھر فرزند نیک بخت پیدا ہوا جس کا نام موسس سلسلۂ قادریہ سے نسبتِ عقیدت سے عبدالقادر رکھا گیا، سید ابو القاسم ترمذی نے جو میرزا عبدالخالق کے یارانِ طریقت میں تھے، مادۂ تاریخِ ولادت "فیض قدس" اور "انتخاب" نکالا، نیز نومولود کے درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کی، عبدالقادر ساڑھے چار سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، چچا میرزا قلندر نے پرورش کی، ساڑھے چھ برس کی عمر میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا، اور سات مہینوں میں ہی ناظرہ ختم کر لیا، اسی زمانہ میں والدۂ مشفقہ نے داغِ مفارقت دیا، دس برس کی عمر میں صرف و نحو عربی پڑھ کے نثر و نظم فارسی کی طرف رجوع کیا اور اس کمسنی میں ہی سب سے پہلے ایک فارسی رباعی کہی۔

مذکور ہے کہ میرزا عبدالقادر ابتداءً رمزیؔ تخلص کرتے تھے، مگر گلستانِ سعدی کا یہ مصرع

بیدلؔ از بے نشاں چہ گوید باز[1]

پڑھ کر ایک کیف محسوس کیا اور روحِ حافظ سے استمداد پر اپنا تخلص رمزیؔ کے بجائے بیدلؔ اختیار کر لیا، وہ دورانِ طالبعلمی میں اپنے ذہنِ رسا کا حال یوں قلمبند کرتے ہیں:

"ہر اثر و حالے کہ بمشاہدۂ ام می رسید بحیثیت نکتبی در راہِ تکاملِ من خدمت می کرد، و ہر کلمۂ کہ بگوشم مواصلت می کرد، مراقدمے جلوتر می کشانید، معنیٔ نکتۂ باریک در مقابلم یک کتاب اسرار وا می کشود، و ہر نکتۂ دفترہائے حقیقت را بازی می کرد، خداوند کریم چنیں یک ہوش تند بمن عنایت کردہ بود"

(بحوالہ بیدل شناسی صفحہ ۶)

اب از خود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبدالقادر نے اپنا تخلص رمزیؔ سے بدل کر بیدلؔ کیوں رکھ لیا؟ میں سمجھتا ہوں اس میں بھی ایک رمز ہے، دل کی حقیقت اہلِ دل سے پوشیدہ نہیں، دل تو سرچشمۂ زندگی ہے، منبعِ حرکت ہے، آئینۂ جمالِ الٰہی ہے، سراپردۂ حقیقت ہے، پھر میرزا نے تخلص بیدلؔ کیوں پسند کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بیدلؔ تخلص محض اپنے جذبۂ عجز و انکسار کے تحت اختیار کیا، رکھا، وہ اپنے وجود کو حقیقتِ عظمیٰ میں فنا دیکھتے ہیں، ورنہ حق یہ ہے کہ بیدلؔ سے بڑا صاحبِ دل دنیائے ادب میں کم ہوگا۔

قدسیؔ کا یہ نعتیہ شعر ؎

---

[1] گر کسے وصفِ او ز من پرسد ؎ بیدل از بے نشاں چہ گوید باز سعدیؔ

مَنِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم   اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے۔

خسرو نے اسی جمالِ جہاں تاب کے مشاہدے پر کہا تھا ؎

پری پیکر نگاری، سرو قدی، لالہ رخساری   سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم

اور اسی شدتِ احساس کو شاعرِ مشرق نے ان الفاظ میں مصوّر کیا ہے:

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے   جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

دل تو ہر سینے میں بھڑکتا ہے، مگر صرف دھڑکن ہی سے زندگی عبارت نہیں، صاف لفظوں میں زندگی زندہ دلی کا نام ہے، ورنہ حالی کبھی نہ کہتے ؎

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا   ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

حالی کے اس زبان زدِ عام شعر کے پردے کھولیے اور دیکھیے یہ سادہ سی بات فکر و فلسفۂ حیات کی کس سرحد کو پہنچتی ہے۔

بیدل نے روحِ حافظ ہی سے استمداد کے بعد رمزی سے بدل کر تخلص بیدل اختیار کیا، حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اسی طرح ما مقیمانِ کوئے دلداریم کی صدائے دلپذیر گونجتی ہے، کیونکہ عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین عشق ہی تو ہے، عشق حیات کا فلسفہ، عشق سازِ ازل کی فغاں ہے، آج بھی اس سے دمادم صدائے کن فیکون بلند ہے، نمو، تغیر، انقلاب، ارتقاء یہی تو اصل حقیقت زمان و مکان ہے، کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ، میرزا بیدل کے فلسفۂ حرکت و حیات کا یہی نغمہ شاعرِ مشرق کے یہاں بھی گونجتا ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی   روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

اس پس منظر میں احساسِ بے دلی سے متعلق خود میرزا بیدل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

من و تابِ وصال و طاقتِ دوری چہ حرف است ایں   اسیری را کہ عشقت خواند بیدل، دل کجا دارد

لمعاتِ عشقِ حقیقی نے ان کے شعور و ادراک کی دنیا منور کر دی تھی، اپنے دل کا حال وہ خود لکھتے ہیں:

نمی دانم چہ برق افتادہ در بنیاد ادراکم   کہ دل داغ شرارِ کاغذی شد در کنارِ من

کوسِ محبت کی صدا نے طلسم خانۂ دل ہی کو زیر و زبر کر دیا ؎

بشکست طلسمِ دل و زد کوسِ محبت   باشید غبارِ نفس و آہ حزیں شد

بیدل پر دلِ روشن کی حقیقت آشکارا تھی، وہ آزاد اور صاف دل کی اہمیت خوب جانتے تھے ورنہ کبھی نہ کہتے ؎

گر حیاتِ جاوداں داری دلِ روشن طلب   آبِ حیواں موجِ از آئینہ اسکندر است

بیدل صوفی تھے اور ایک فلسفی صوفی، غوامض تصوف سے آشنا، رموزِ عرفانیات سے آگاہ، تصوف میں عزلت نشینی اور خلوت گزینی کی بڑی اہمیت ہے، مگر بیدل اس راہ میں بھی زندگی کی خیرات بانٹتے ہیں، حیات کا درس دیتے ہیں، جو عین حرکت و عمل سے عبارت ہے، گویا ان کی نظر میں بھی دم بدم پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی، اور یہ زندگی آزادی و روانی کا دوسرا نام ہے، کیا اچھی تمثیل پیش کرتے ہیں ؎

بر دلِ آزادہ از عزلت مبند افسردگی   ہر کجا آبِ رواں یخ بست سنگِ مرمر است

لہٰذا ؎

ز دلِ فسردہ بنالۂ نرسید تاب و تبِ نفس   ببرید ناخنِ مطرب از گرہ بریشم چنگِ ما

بیدل خود ایک عظیم صاحبِ دل تھے اور صاحبدلی کی برکتوں سے باخبر، ان کا شعر ہے ؎

برحلاوت می فزاید الفتِ صاحبدلاں — میوۂ نخلے کہ پیوندش کنی شیریں تراست

مگر انھوں نے اپنا تخلص بیدل پسند کیا، یہ صرف ان کی کسرِ نفسی، عجز اور انکسار ہے، کہتے ہیں ؎

بلند است آنقدر ہا آشیانِ عجزِ ما بیدل — کہ بے سعی شکستِ بال و پر نتواں رسید آنجا

بیدل کے قصیدوں میں ایک قصیدہ "قصیدۂ نیرومندی در مدحِ شہزادۂ اعظم" ہے، اس قصیدہ میں بھی بیدل نے اپنے تخلص کی طرف واضح اشارہ کیا ہے ؎

صورتِ احوالم از طرزِ تخلص روشن است — بیدلی ہا چیدہ ام بر خود زوضعِ روزگار

گر شود ابرِ عنایت آبیارِ مزرعم — خوشہ سان از پائے تا سر جملہ دل آرم بہار

چنانچہ استاد صلاح الدین سلجوقی نے بھی اپنی کتاب "نقدِ بیدل" کی تمہید میں لکھا ہے :

"صوفیِ متواضع ما باآنکہ پُر دل و سراپا دل است، خود را بیدل می خواند، با وجود آنکہ روح خالص و عقل مجرّد است، خود را در قطار جمادات بے جان و بے حس می شمارد۔"

(بحوالہ "بیدل شناسی" از غلام حسن مجددی ص ۳۷)

میرزا عبدالقادر نے جب آنکھ کھولی اور شعور کو پہونچے تو ہر سمت صولت و دبدبۂ شاہجہانی کا مشاہدہ کیا، ان کی رگوں میں مغول چنگیزی کا خون گردش کناں تھا، چونکہ شخصیتیں نسل اور ماحول کی زائیدہ و پروردہ ہوتی ہیں اور ان ہی کے زیرِ اثر تصورات و تخیلات بار پاتے ہیں، لہٰذا میرزا بیدل کی شخصیت بھی بہر جہت معتبر، توانا اور عہد ساز ہوئی، بلند حوصلہ، جواں عزم، عالی ہمت اور مردانہ جرأت ان کی شخصیت کے عناصر ٹھہرے، اس معیاری شخصیت نے ان کے رشحاتِ قلم کو فکر و خیال کی وہ درخشندگی عطا کی جس نے ادب میں فلسفہ و اخلاقیات کے طلسم خانے جگمگا دیے، مثنوی "کارِ دانِ عرفان" ہو، یا "طلسمِ حیرت" و "محیطِ اعظم" نکات پر ارزش ہوں یا قصائد و رباعیات، ہر جگہ اپنی بے مثال قدرتِ سخن سے فکر و فلسفۂ حیات کا نگار خانہ سجا دیا ہے، بالخصوص جب ہم بیدل کی غزلیات کا

مطالعہ کرتے ہیں تو ایک ایسے آہنگ تند و تیز کا احساس ہوتا ہے جو زندگی سے لبریز اور حرکت آفریں ہے۔

غالباً یہی سبب ہے کہ کلامِ بیدل وسط ایشیا کے ان حصوں میں زیادہ مقبول و متداول ہے جہاں کی زندہ و فعّال قومیں حرکت و عمل آشنا ہیں، افغانستان، ازبکستان، تاجیکستان وغیرہ کے مدارس میں اشعارِ بیدل داخلِ نصاب ہیں، اور عوام بیدلؒ کو اپنا محبوب شاعر سمجھتے ہیں۔

بیدل ایک صوفیٔ باصفا، ایک شاعرِ خوشنوا، ایک مصلحِ اخلاق، ایک مبلّغِ انسانیت اور ایک دانشورِ بے مثال تھے، ایک بیدار ذہن مفکر کی حیثیت سے بیدل نے الٰہیات و خلقتِ کائنات، نظامِ عالم و آویزشِ خیر و شر اور حیاتِ انسان کے انفرادی و اجتماعی پہلوؤں پر غور کیا ہے، ان کے سینہ میں ایک عارف کا دل تھا، جو عشقِ خداوندی و محبتِ بشر سے مملو، حسن و جمال کے احساسِ شدید کا حامل اور مظاہرِ کائنات کی نیرنگیوں کا رمز آشنا تھا، بیدل عظمتِ بشری کے قائل تھے، لہٰذا انسانیت کا درس اور اخلاقیات کا سبق ان کے کلام کی آبرو ہے، ایک عظیم دانشور کی حیثیت سے اس نابغۂ بے عدیل کا مرتبہ بہت بلند ہے، بیدل کے اشعار میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، تصوف و عرفان کے اعلیٰ مسالک اور اجتماعی علوم کی بہترین قدروں کی ترجمانی ہے۔

بیدل نے یہ سب کچھ ایک طرزِ بدیع، اسلوبِ منفرد اور پیرایۂ خاص میں پیش کیا ہے جس کی پیروی مشکل ہی نہیں ناممکن سمجھی گئی، بیدل کا یہ سبک مخصوص انھیں سبکِ ہندی کے دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے، انفرادی تزکیۂ نفس کی تعلیم ہو یا ارتقائے اجتماعی کا درس، رموز و اسرارِ زندگی کی تفہیم ہو یا حصولِ اقدارِ عرفانی کی تشویق، ہر جگہ بیدل نے سعی و مجاہدہ کو ایک شرطِ لازم قرار دیا ہے، اور اس کی موثر تلقین کی ہے کتنا دل آویز پیرایۂ بیان ہے :

متاعے را کہ جہد آمد خریدار — اگر عنقاست بیعش نیست دشوار

بقدرِ جہد ہر کس مزد یاب است — خوش آں جہدے کہ منظورش ثواب است

کتنی تاکید ہے ان اشعار میں ؎

جہد دانائی ست، جہل مگیر | در طلب فیضہاست سہل مگیر
شبنمے گر بجہد می تازد | اشک را آفتاب می سازد

زندگی خود ایک جہادِ مسلسل ہے، اس میں محنت و مشقت اور حرکت و عمل کی کتنی اہمیت ہے، اس پر ہر اہلِ نظر نے روشنی ڈالی ہے، اقبالؒ نے بھی کہا ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم | جہادِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

بیدل کا تعلق تاریخِ ہند کے جس باب سے ہے وہ سیاسی آویزشوں اور شکست و ریخت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، شاہجہاں کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جو رزم آرائی رہی، بیدل نے بہت نزدیک سے اس کا مشاہدہ کیا تھا، میرزا عبداللطیف قو[ر]اندان بیدل کے چچا میرزا قلندر کے قرابت دار اور شجاع کی فوج میں کماندار تھے، بیدل بھی میرزا عبداللطیف کی فوج کے ساتھ تین۳ ماہ تک رہے، اورنگ زیب نے جب ۱۶۵۹ء میں شجاع کو شکست فاش دی تو دس دنوں تک بیدل میرزا عبداللطیف کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر جنگلوں میں پھرتے رہے،

بیدل جسمانی طور پر نہایت قوی اور طاقت ور تھے، سیاسی الٹ پھیر کے بعد دہلی میں انھوں نے ۱۰۷۹ھ میں شادی کر لی، اور خاندانی پیشۂ سپہگری کو ہی وسیلۂ معیشت بنایا، شہزادۂ اعظم شاہ نے بیدل کی فارسی و ترکی زباں دانی سے متاثر ہو کر انھیں منصب پنج صدی پر فائز کیا، بیدل کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ کشتی لڑتے تو اپنے حریف کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر زمین پر دے مارتے، عراقی گھوڑے کے ساتھ دوڑ لگاتے تو اس کو پیچھے چھوڑ دیتے (سفینۂ خوشگو ص ۱۱۱ - ۱۱۰)

یہاں اس تذکرے سے میری مراد صرف یہ دکھانا ہے کہ بیدل کی نظر میں قوت و طاقت جسمانی و روحانی کی کتنی اہمیت تھی، غلام حسن مجددی لکھتے ہیں:

"بیدل بہ تربیت بدنی و ارمان نیز اہتمام داشت و عصاے فیلی وزنی و قوی بدست می گرفت ..

..... بیدل در ستایش عصای خود چنیں گفتہ است،،

سنت الانبیاء، زینت الصلحاء، مونس الاعمٰی، ممد الضعفاء، دافع الاعداء"

(بیدل شناسی ج ۱ ص ۶۴)

بیدل اپنی ایک رباعی میں اس فلسفۂ قوت کو یوں بیان کرتے ہیں:

بیدل بر خلق کسر شان ننمای | تا تیر تواں شدن کماں ننمای
خاصیت ایں معرکہ عاجز کشی است | اینجا زنہار ناتواں ننمای

حسین علی خاں کے قاتل محمد امین خاں نے ایک بار بیدل کے داڑھی تراشنے پر طنز کیا تھا، بیدل نے فوراً کہا: "من ہر یش خود را می تراشم و تلب کسے را نمی خراشم"۔ یہ سن کر خان مشتعل ہو گیا اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ لے گیا، بیدل نے کھڑے ہو کر امین خان کو جنگ بامشت کی دعوت دی، مگر حاضرین نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔

بیدل کی قوتِ برداشت اور تحمل کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۱۲۳ھ میں ان کا اکلوتا بیٹا دو سال ۹ نو مہینے ۸ آٹھ روز کا ہو کر فوت ہوتا ہے تو انھوں نے بڑے صبر و ضبط اور تحمل کے ساتھ اس کے دفن کا انتظام کیا، خود کفن پہنایا اور تابوت گھر سے باہر لائے، اس اندوہِ عظیم کا اظہار بیدل نے ایک جگر گداز مرثیہ میں کیا ہے جو مخمس کے اٹھارہ بند پر مشتمل ہے۔

یہ تھی بیدل کی تربیت قلبی و روحانی جو صرف تصوف کی دین ہے، بیدل کے نزدیک تصوف تمام علوم میں بہترین و عمیق ترین علم ہے، محمد افضل سرخوش نے بھی جو بیدل کا رقیب تھا، ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ

"بیدل در فقر و توکل بادشاہِ وقتِ خود است"

لہٰذا بیدل کے منفرد اسلوب میں جو قوت و شدت ہے اس کے یہی مختلف اور گوناگوں اسباب ہیں۔ بیدل کا عقیدۂ راسخ، پختہ ایمان، جذبۂ عشقِ الٰہی، طمانیتِ قلبی، ارتقائے روحانی، مشاہدۂ عرفانی، نیز شجاعت و مردانگی اور اعلیٰ صفاتِ انسانی، ان تمام عوامل نے شخصیتِ بیدل کی تعمیر میں ایسی صلابت پیدا کر دی جس کا انعکاس ان کی تصانیف لطیف میں ناگزیر تھا، بیدل نے اپنے اشعار میں زندگی کا بڑا ڈائنامک فلسفہ پیش کیا ہے، ان کی شعری اصطلاحیں، الفاظ کا انتخاب، طویل مترنم بحریں، لب و لہجہ کا بانکپن، فکر و تخیل کی تازگی ہیں جس متحرک زندگی کا شعور بخشتی ہیں، اس کا اندازہ بیدل کی غزلیں پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ شد درین درسگاہِ عبرت بفہمِ چندیں رسالہ پیدا — جنوں سوادے کہ کردم امشب ز سیرِ اوراق لالہ پیدا

اگر بصد رنگ بر فشانم، ز دامِ جستن نمی توانم — کہ کردہ پرواز بے نشانم، ز بالِ طاؤس بالہ پیدا

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو سمن درآ — تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا، بچمن درآ

عشق اگر در جلوہ آرد پرتوِ معنیٔ ورا — از گدازِ دل دہد روغن چراغِ طور را

از فلک بے نالہ کامِ دل نمی آید بدست — شہد خواہی آتشی زن خانۂ زنبور را

تہی شو از خودت راحت شمر آفاتِ دنیا را — گر ایں کشتی نداری از محیطِ بیکراں مگذر

بخوانِ نعمتِ اہلِ دول ننگ است خو کردن — اگر آدم سرشتی در چراگاہِ خراں مگذر

یہ سبکِ بیدل سبکِ ہندی ہے، اکثر ناقدین نے بیدل کو پیچیدہ گوئی، دشوار فہمی اور مشکل پسندی سے متہم کیا ہے، حالانکہ اشعارِ بیدل کا معتدبہ حصہ صفائی زبان و سلاست بیان اور شیرینی و دلآویزی کا آئینہ ہے، فلسفیانہ نکات، عارفانہ مسائل اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات عام فہم اور جالبِ توجہ یوں بھی نہیں ہوتے، مگر بیدل نے اسے سہل مگر مستحکم انداز بیان میں پیش کیا ہے، نازک مضامین اور باریک خیالات کے لیے ذہنِ رسا ہی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں ؎

معنیٔ بلندِ من فہمِ تند می خواہد — سیرِ فکرِ ما آساں نیست کو ہمّتِ دلِ دارم

مدعی درگذر از دعویٔ طرزِ بیدل — سحرِ مشکل کہ بہ کیفیتِ اعجاز رسد

دلی را دلی می شناسد کی طرح فلسفی را فلسفی می داند، علامہ اقبال نے میرزا بیدل کے عنوان سے تین اشعار لکھے ہیں، بیدل کے ایک فلسفیانہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے ان کی خوب گوئی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

ہے حقیقت یا مری چشمِ غلط بیں کا فساد — یہ زمیں، یہ دشت، یہ کہسار، یہ چرخِ کبود

کوئی کہتا ہے نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہے — کیا خبر ہے یا نہیں ہے، تیری دنیا کا وجود

میرزا بیدل نے کس خوبی سے کھولی یہ گرہ — اہلِ حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود

"دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن — رنگِ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود"

دیکھیے حکمت کے ایک ادق مسئلہ کو کس آسانی سے حل کر دیا، یہی وہ سحرِ مشکل ہے جس کو اعجاز کی کیفیت نے بیدل کے یہاں سحرِ حلال بنا دیا ہے۔

زندگی کے سوتے دل ہی سے پھوٹتے ہیں، مادی ہوں یا روحانی، دورِ گردش ہی زندگی کا دوسرا نام ہے ؎

جہد ہرگز نمی شود پامال — ریشہ از دویدن است نہال

بیدل کی فنکاری یہ ہے کہ فکر و خیال کے تانے بانے وہ اسی مرکزِ حیات کے گرد بنتے ہیں، اسی افق سے خورشیدِ حقیقت کا طلوع ہوتا ہے، اور اس کی قرمزی کرنیں ذہنِ بیدل کی اختراعی کاوشوں سے آمیز ہو کر فکر و فن کے متنوع اور متحرک پیکر تراشتی ہیں، صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بخیالِ چشم کہ می زند قدحِ جنوں دلِ تنگِ ما — کہ ہزار میکدہ می دود بر کابِ گردشِ رنگِ ما

بدلِ شکستہ ازیں چمن زدہ ایم بالِ گذشتنی — کہ شتاب اگر ہمہ خوں شود نہ رسد بگردِ درنگِ ما

زولِ فسردہ بنالۂ نرسید تاب و تبِ نفس بہ بریدِ ناخنِ مطرب از گرہِ بریشمِ چنگِ ما

بیدل کا قولِ گرامی ہے کہ "گر راہ قوت جسم جہد آدمی است"

اس کی روشنی میں ان کا عالمگیر پیغام ملاحظہ ہو، پیام عزم و حوصلہ، پیام جرأت و مردانگی ؎

بوصول مقصد عافیت نہ دلیل جونہ عصا طلب تو ز اشک ایں ہمہ کم نۂ قدمے ز آبلہ پا طلب

اور ان سب کی اساس اس یقین محکم پہ ہے جو قلبِ مومن کی جان ہے ؎

خوشت آنکہ ترک سبب کنی بقیں رسی و طرب کنی ز حقیقت انچہ طلب کنی بطریق بیدل ما طلب

وہ حرکت و اضطراب کو زندگی کی بیّن علامت ہی نہیں اس کا مرادف سمجھتے ہیں ؎

تا نفس آئینہ است زیں طپشم چارہ نیست ذرہ عدم می شود از عدمِ اضطراب

ہیچ موجودے بعرض شوق ناقص جلوہ نیست ذرّہ ہم در رقص موہومے کہ دارد کامل است

اور یہی زندگی ذروں کے جگر میں خورشید کے لہو کی ضمانت ہے۔

مجدّدی لکھتے ہیں :

"نیروی ذہنی فوق العادۂ بیدل تا آخریں لمحاتِ حیاتش بصورتِ صحیح فعال

بودہ است "

بیدل اواخر محرم ۱۱۳۳ھ میں تپِ محرقہ کے شکار ہوئے، دوم صفر کو تمام رات تیز بخار رہا، ان کے دوست نواب غیرت خاں بہادر صلابت جنگ ساری رات جاگتے رہے، بیدل کبھی بیہوش ہو جاتے اور کبھی انھیں ہوش آجاتا، اسی درمیان میں حواس بحال ہوئے تو بے اختیار ہنستے رہے، وقت سحر بحران ہوا، اور بالآخر مالک حقیقی سے جا ملے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اقبال انسٹیٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر کا ایک سمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۳؍ اکتوبر سے ۷؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء تک کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے اقبال انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایک سمینار "اسلام عصر جدید میں: اس کے مسائل اور امکانات" کے عنوان سے تھا، اس کے روح رواں پروفیسر آل احمد سرور تھے، جو اس وقت اقبال انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں، اور یہاں آنے سے پہلے وہ اردو ادب کے مایۂ ناز ادیب، نقّاد اور خوش بیان مقرر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، انھوں نے کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے یہ سمینار منعقد کرا کے کشمیر کی مذہبی اور علمی زندگی میں بڑی حرکت پیدا کر دی.

کشمیر پہلے بھی جا چکا تھا، مگر اس سمینار کا دعوت نامہ آیا تو کشمیر کی پرانی یاد تازہ ہو گئی، فیضی کے اشعار ذہن میں آئے ؎

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر کہ بار عیش کشاید بعرصۂ کشمیر

تبارک اللہ ازاں عرصۂ کہ دیدنِ او ورق نگارِ خیال است و نقش بند ضمیر

ہوائے او متنوع چو فکرتِ نقاش زمینِ او متلوّن چو صفحۂ تصویر

پھر عرفی کے ان اشعار کی وجہ سے کشمیر پہونچنے کا شوق اور تیز ہو گیا ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

بنگر کہ ز فیضش چہ شود گوہر یکتا — جائے کہ خزف گردد و آنجا گہر آید

وانگہ بنگر فصل کہ در ساحت گلزار — از لطف ہوا چاشت نسیم سحر آید

اس دعوت نامہ کے آنے سے پہلے سری نگر کے ایک علم دوست، معارف نواز اور میرے انتہائی کرم فرما جناب محمد امین پچھ صاحب کا بڑا دیرینہ اصرار تھا کہ میں کشمیر میں ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں، وہ دوستی کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھانے کو سعادت سمجھتے ہیں، اور یہ شعر ان کے سامنے رہتا ہے ؎

براہ دوستی ہا ہر کہ بے منت قدم ساید — بہر گامے کہ بردارد از و پائے زمن چشمے

ان کا خاندان بڑا علم دوست رہا، انھوں نے کشمیر کے نغز گو شاعر، عارف باللہ، مولانا شمس الدین کامل حیرت کے دامن میں برسوں تربیت پائی جو سلسلۂ کبرویہ سے منسلک اور کشمیر کے مشہور بزرگ طریقت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے معتقد تھے، جناب محمد امین صاحب کے ذریعہ سے ان کی یہ دو پُرکیف غزلیں پڑھ کر محظوظ ہونے کا موقع ملا:

من مست مے ہوشم پیمانہ بہ پیمانہ — نظارۂ خاموشم جانانہ بہ جانانہ

آں صاف سفالستم در کسوت مینائی — صد آتش مے دیدم میخانہ بہ میخانہ

دردے کہ در آنجا بود دلہا ماندہ مخمورا — سرداد بہ شیدائی مستانہ بہ مستانہ

حرف شکن زلفش عہدیست کہ می گوید — زیں قصہ ہمی زاید افسانہ بہ افسانہ

جائے کہ ودیعت بود اندر جگر حیرت — فرہاد ز مجنوں یافت دیوانہ ز دیوانہ

جگر بہ یاد عقیق لعلش یمن نہ گردد دگر چہ گردد — دل از ہوائے عبیر زلفش ختن نہ گردد دگر چہ گردد

بہ خوش نصیبی بناز اے جاں بجا کہ امر بگذری خرامان — ز حسن روئے تو کنج تربم چمن نہ گردد دگر چہ گردد

چو بگذری بر سر مزارم کشیدہ داماں کشادہ ابرو — کف امیدم برون ز جیب کفن نہ گردد دگر چہ گردد

بہ ورد نام امیر ہمداں علی ثانی ظہیر دوراں — چو لعل دل از شکر افشاں دہن نہ گردد دگر چہ گردد

چو شمس شیدائے پیر آمد گدائے کوئے امیر آمد — اگر بہ بخشش ز شوق مو سخن نہ گردد دگر چہ گردد

جناب محمد امین صاحب، جناب مولانا شمس الدین کامل حیرت کی تربیت کے اثر سے بقول ان ہی کے صاحبدلوں، عارفوں اور عالموں کے خادم بنے رہے، گو اخبار نویس ہونے کے ساتھ سرکاری ملازمت بھی کی، اور حکومت کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، سری نگر کے ایک مشہور اخبار چنار کے اڈیٹر بھی رہے، ان کا موجودہ خاندان بھی بڑا تعلیم یافتہ ہے، ان کے ایک بھائی خواجہ محمد یوسف مسلم یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر خواجہ منظور حسین کے بڑے محبوب شاگرد تھے، انھوں نے ۱۹۴۲ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے میں جو ریکارڈ قائم کیا اس سے آگے اب تک کوئی نہیں جا سکا ہے، وہ حکومت پاکستان کے وزیر رہنے کے بعد اس وقت اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے ایک مشیر ہونے کی حیثیت سے نیویارک میں مقیم ہیں، ان کے ایک اور بھائی خواجہ غلام نقشبند (ایم۔ ایس۔ سی۔ علیگ) انڈین فارسٹ سروس میں چیف کنزرویٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد دہلی میں حکومت کشمیر کی طرف سے ریذیڈنٹ کشمیر رہے، اب پنشن پاتے ہیں، جناب محمد امین پچھ صاحب کے بڑے لڑکے مصباح انور پچھ صاحب سعودی عرب میں انجنیر ہیں، ان کے داماد محمد یعقوب قریشی صاحب بھی انجنیر ہیں جو جموں میں اس وقت ہیں، ان کے چھوٹے لڑکے شاہد روح الامین بزنس میں لگے ہوئے ہیں۔

ایسے خاندان کے ساتھ کچھ دن گذارنے میں بڑی خوشی تھی، مگر ہم راستے کی خرابی کی وجہ سے اپنی فیملی کے ساتھ سری نگر بڑی پریشانی میں وقت مقررہ سے چونتیس ۳۴ گھنٹے دیر کرکے پہنچے تو دس بجے رات کا وقت تھا، جناب محمد امین پچھ صاحب کو اپنے ایک دوست جناب عبدالحق برق کے ساتھ مسلسل چھ ۶ گھنٹے انتظار میں گذارنا پڑا، جس سے مجھ کو بڑی تکلیف ہوئی، رات کافی گذر چکی تھی محمد امین صاحب کی

کوٹھی سرینگر کے آخری حصہ برین میں تھی، جہاں اس وقت جانا مناسب نہیں سمجھا گیا، اس لیے سرینگر کے وسط میں ریزیڈنسی روڈ پر ایک ہوٹل اوڈلی این میں قیام ہوا۔

دوسرے دن جب محمد امین بچھ کے ساتھ جناب پروفیسر آل احمد سرور سے ملا تو معلوم ہوا کہ سیمینار کے مہمانوں کے قیام کا انتظام یونیورسٹی کے مہمان خانوں میں کیا گیا ہے، وہیں منتقل ہوگیا، جہاں سبھی جانے بوجھے لوگ آکر مقیم ہوچکے تھے، ان ہی میں جناب سید شہاب الدین دسنوی اور جناب ضیاء الحسن فاروقی تھے، جن کی وجہ سے بڑی عافیت پہونچی، اس سیمینار میں جناب آل احمد سرور صاحب کے بعد سب سے زیادہ متحرک اور سرگرم عزیزی ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کو پایا، جن کا بچپن دارالمصنفین کے احاطہ میں گذرا ہے، اس وقت وہ اقبال انسٹیٹیوٹ میں فارسی کے ریڈر ہیں، انھوں نے ہر طرح کی عافیت پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

۳ر اکتوبر کو جناب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر کی صدارت میں روایتی شان کے ساتھ سیمینار کا آغاز ہوا، شیخ صاحب کا خطبہ پُر مغز اور پُر اثر تھا، ان کا یہ کہنا بڑا معنی خیز تھا کہ اسلام جمہوریت کی روح، تنگ نظری کا دشمن اور بھائی چارہ کا درس دیتا ہے، جیسے جیسے ہندوستان میں جمہوریت جاگزیں ہوتی جائے گی اور سیکولرزم وظیفۂ لب ہونے کے بجائے دل کی دھڑکن اور ذہن کی کرن بنتا جائے گا، ویسے ویسے اسلام کی عالمگیر قدروں کا احساس بڑھتا جائے گا، کیونکہ اسلام ساری انسانیت کی نجات کا پیغام لے کر آیا ہے۔ شیخ صاحب اپنے خطبہ میں اقبال کے اشعار پڑھنے لگے تو ان پر رقت طاری ہوگئی، معلوم ہوا کہ اقبال کے کلام سے ان کو بڑا عشق ہے، سیمینار کا افتتاح جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کیا، جن کا خطبہ انگریزی میں تھا، اس میں جو علمی، تاریخی اور تحقیقی رنگ تھا، اس کو سن کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کسی ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس کا خطبہ ہے یا ایک پختہ کار اور دیدہ ور اہل قلم کی تحریر ہے، افسوس ہے کہ جناب شیخ عبداللہ اور جناب سید حامد کے خطبات

تقسیم نہیں کیے گئے، ان کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں بر وقت تیار نہیں ہوسکیں، حالانکہ ایسے باوقار خطبے تمام حاضرین و سامعین کے ہاتھوں میں ہونے چاہیے تھے، جناب بدرالدین طیب جی ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس اور سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو سیمیناروں سے بڑی دلچسپی ہے، وہ ہر اچھے سیمینار میں جلوہ گر ہوتے ہیں، انھوں نے اس موقع پر اپنا کی نوٹ ایڈریس یعنی کلیدی خطبہ پڑھا، اس میں بہت سی مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی، لیکن جب انھوں نے پنڈت سندر لال آنجہانی کی ایک گفتگو کا ذکر کیا تو جذبات میں بڑا ارتعاش پیدا ہوا، پنڈت جی نے کہا کہ ہندو مذہب پانچ چھ ہزار برسوں سے قائم ہے، لیکن اس عرصہ میں اس میں ایسی ایسی چیزیں شامل ہوگئی ہیں کہ اس کی اصلی صورت بہت بگڑ چکی ہے، لیکن مسلمان جس طرح اپنے پیغمبرؐ کی اعلیٰ، ارفع اور بے مثال تعلیمات سے دور ہو رہے ہیں، اس بنا پر ڈر ہے کہ اسلام اس کی نصف مدت ہی میں مسخ ہوکر نہ رہ جائے جتنے میں کہ ہندو مذہب ہوا، پنڈت جی کی یہ بات ہر مسلمان کے ذہن میں حاوی اور طاری رہنی چاہیے۔

سیمینار میں قدیم اور جدید عالموں اور دانشوروں دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مولانا ابوالحسن علی ندوی تو اس کا افتتاح کرنے والے تھے، مگر وہ اپنے بیرونی سفر کی وجہ سے وہاں تشریف نہ لا سکے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی مدعو تھے، مگر وہ بھی نہ پہونچ سکے، علماء کی نمائندگی باہر سے مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولانا مجیب اللہ ندوی کی وجہ سے ہوئی، دارالمصنفین، جامعہ ملیہ دہلی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی نمائندگی بھی تھی، سیمیناروں میں ایسے لوگوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے جو اچھا بول سکتے ہیں اور ہر مقالہ پر بحث کرکے مناظرانہ رنگ پیدا کر سکتے ہیں، خواہ وہ اپنے خیالات کیسے ہی رکھتے ہوں، اسی لیے اس سیمینار کا جو موضوع تھا اس کی مناسبت سے اس میں یہ باتیں بھی خلاف توقع سننے میں آئیں کہ خلفائے راشدین نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرکے بڑی غلطی کی، خلافت راشدہ کے عہد کے معاشرہ کو آئیڈیل

کیسے کہا جا سکتا ہے، جب کہ اس کے تین خلفاء قتل کیے گئے، یہ قطعی بالکل غیر اسلامی چیز ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ علماء ہی کو اسلام سمجھنے اور سمجھانے کا حق حاصل ہو، غیر علماء بھی اسلام کو سمجھ کر سمجھا سکتے ہیں، پہلے خدا اور انسان کے درمیان کے ایچ کی وضاحت کر لی جائے، پھر مذہب کی نوعیت کا تعین کیا جائے، مذہبی عقیدہ ذاتی عقیدہ ہوتا ہے، اس میں بیرونی مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی، اسلامی قوانین کی تعبیرات اور اجتہادات میں ہم کو ایک امیر علی، ایک فیضی اور ایک طیب جی کی ضرورت ہے، وحدت ادیان کا تصور عین اسلامی شعائر میں سے ہے، قرآن اور سنت کی میکنیکل تعبیرات اور تصریحات سے اسلامی مسائل کا حل نہیں نکالا جا سکتا ہے، سیکولرزم کے علاوہ اسلامی سیاست میں کسی دوسرے تصور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی آوازیں زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے اٹھائی جاتی ہیں جو اسلام کے بائیں بازو سمجھے جاتے ہیں، اس اصطلاح کی آڑ میں ان کے بہت سے نظریے کی ترویج ہو جاتی ہے، جس کو وہ خود اپنی زبان سے کہنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ایسے سیمیناروں میں روشن ضمیر اور گویا قسم کے علماء بھی شرکت کرتے رہیں، تاکہ ان بائیں بازو کے علمبرداروں کی طلاقت لسانی کا جواب اپنی قوت گویائی سے دیتے رہیں، کیونکہ ایسے سیمیناروں میں علم و فضل سے زیادہ قوت گویائی زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

مگر اس سیمینار کا روشن پہلو یہ تھا کہ اس میں کچھ لوگ خصوصاً بعض نوجوان طلبہ ایسے بھی تھے کہ جب حیلہ کا فرنگی اور عقل کی دہائی سے کوئی بات اسلامی عقائد و روایات کے خلاف کہی جاتی تو وہ حملہ ترکی بہ ترکی کے لیے تیار رہتے، سیمینار میں ایسے پُر جوش اور حاضر جواب طلبہ کسی اور یونیورسٹی میں کم دیکھنے میں آئے، ان کی علمی تیر اندازی اور صید افگنی کی وجہ سے سیمینار میں اسلامی فضا قائم رہی اور ہر نشست میں حاضرین کی تعداد توقع سے زیادہ تھی جو اس مجلس سے کچھ سیکھ کر کچھ تحفے لے جانے کے لیے آتے رہے، اور وہ یقیناً

محظوظ ہوئے ہوں گے، جب ان کے کانوں میں یہ باتیں بھی پڑیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، انسانی زندگی کو انفرادی و اجتماعی انداز سے سنوارنے، نکھارنے، پروان چڑھانے اور اس میں جوشِ عمل پیدا کرنے کا نام ہے، اس کے آفاقی اور انقلاب آفریں پیغام کو آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو آج سے چودہ سو (۱۴۰۰) سال پہلے حاصل تھی، موجودہ دم توڑتی اور سسکتی انسانیت کے لیے اسلام کی تدریں آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہیں، ایک مقالہ میں یہ بھی کہا گیا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی مآل اندیشی سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ آئندہ زمانہ اور ماحول کے بدلنے سے نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے، جن میں سے تقاضوں اور مطالبوں کو قبول کرنا ناگزیر ہوگا، اسلام کی ہمہ گیری اور عالمگیری کو قائم رکھنے اور اس کو جمود سے بچانے کی خاطر حالات کی تبدیلی کا ساتھ دینا ضروری ہوگا، اس لیے حضرت عمرؓ نے اجماع کے علاوہ قیاس کا بھی اضافہ کیا کہ جس چیز کی نسبت تم کو قرآن و حدیث میں حکم نہ ملنے کی وجہ سے شبہ ہو تو اس پر غور کرو، غور کرو، خوب غور کرو، اس کے ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو دریافت کرو، پھر کوئی فیصلہ کر لو، مگر اس کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جو مسئلہ قیاس شرعی سے ثابت کیا جائے اس کے بارہ میں یقین کر لیا جائے کہ قرآن مجید یا حدیث میں کوئی خاص حکم موجود نہیں ہے، اور پھر قیاس انفرادی نہ ہو، بلکہ اجتماعی ہو، اور اگر اجتماعی نہ ہو تو اہل الرائے کی اکثریت سے ہو، اہل الرائے سے مراد فقہاء ہیں، ایک مقالہ میں یہ بھی کہا گیا کہ رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز اپنے سارے اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا، لیکن اللہ کے بندوں کے سارے حقوق پامال کیے ہوگا، وہ آخر کار جہنم رسید ہوگا، ایک مقالہ میں یہ بھی دکھایا گیا کہ اسلام انفرادی ملکیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے، وہ معاشی مساوات کا غیر فطری نعرہ نہیں لگاتا بلکہ وہ معاشی انصاف کا فلسفہ اور عملی حل پیش کرتا ہے۔

ان تمام مقالات پر اچھی بحثیں بھی ہوتی رہیں، صرف جناب حسن ثانی کا ایسا مقالہ تھا جس کو

کوئی بحث نہیں ہوئی، یہ اسلامی تصوف پر تھا، اس کو انھوں نے ایسے خوبصورت انداز میں پڑھا کہ پورے مجمع کو لوٹ لیا، ہر طرف سے داد و تحسین کی صدا بلند ہوئی، جس سے پتہ چلا کہ لوگ علمار کے دار و گیر سے اگر پریشان ہوتے ہیں تو صوفیائے کرام کی رواداری اور باطنی تعلیمات سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔

کچھ ایسے مقالے بھی تھے جن کا تعلق سیمینار کے اصل موضوع سے نہ تھا، البتہ اس کے داعی پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ جو "جدید دنیا میں اسلام ۔ مسائل اور امکانات" کے عنوان سے تھا، وہ اس موقع کے لیے بہت ہی موزوں تھا، وہ اچھے ادیب اور انشار پرداز بھی ہیں، اس لیے اپنے غیر ادبی مضمون میں بھی اپنے خاص اسلوب بیان سے ادب اور انشار کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں، اردو ادب میں ان کا ایک خاص موضوع "ادب میں روایت اور بغاوت" بھی رہا ہے، وہ روایت کی عظمت کے قائل ہیں، لیکن اس کی بعض باتوں سے بغاوت کرنے کے بھی حامی رہے ہیں، اسی بات کو اپنے موجودہ مقالہ میں اعتدال اور توازن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی، اسلام کی قدیم قدروں کے معترف ہونے کے ساتھ وہ موڈرنزم کی موج کی عظمت اور طاقت کا بھی احساس دلانا چاہتے ہیں، موڈرنزم کے لیے جدید کاری کی اصطلاح استعمال کی جو شاید ان ہی کی وضع کردہ ہے، انھوں نے اس کی طرف بہت ہی اچھے انداز میں توجہ دلائی کہ موجودہ دور میں مادی خوشحالی نے بدن کو بیدار اور روح کو خوابیدہ کر دیا ہے، انسان مشین پر حکومت نہیں کر رہا ہے، بلکہ مشین انسان پر حکومت رہی ہے، جمہوری ادارے جمہور کی آواز نہیں رہے، حکومت یا سرمایہ کے ہاتھوں میں کھلونے بن گئے ہیں، فرد کی آزادی کی لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد ہونا چاہتا ہے، طاقت کی پرستش نے بے رحمی اور سخت دلی پیدا کی ہے، عورت کی بے لگام آزادی نے اسے شتر بے مہار بنا دیا ہے، وہ مردوں سے ہزاروں سال کے ظلم و جبر کا انتقام لینا چاہتی ہے، تعلیم نے مہارت پر زور دیا ہے، سیرت سازی پر توجہ نہیں کی، اس نے علم دیا ہے، بصیرت نہیں دی،

ہنر دیا ہے، نظر نہیں پیدا کی، سرمایہ دارانہ سماج فلاحی ریاست کے ذریعہ سے اپنی اصلاح کی ناکام کوشش کر رہا ہے، مگر اشتراکی سماج نے بھی جو عوام کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، ایک نئے طبقے کو جنم دیا ہے، جو مادیت اور اقتدار کو سب کچھ سمجھتا ہے، اور پرانے تہذیبی ورثہ سے صرف ایک عجائب خانے کی زینت کا کام لیتا ہے، یہ جدید کاری پر کیسا جامع اور دلآویز تبصرہ ہے، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی کہ جدید کاری کو گمراہی اور پستی، شیطنت اور بے راہ روی سمجھنا بھی غلط ہے، اور پھر یہ مشورہ دیا کہ اس زریں اصول پر عمل کیا جائے جو خذ ما صفا ودع ما کدر کے مقولے میں پوشیدہ ہے، اور ان کی یہ تجویز ہے کہ صحیح دانشوری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ہماری مذہبی قدروں سے نہ صرف واقف ہو، بلکہ ان پر ایمان رکھتی ہو، اور جدید دور، جدید علوم اور جدید زندگی کے تقاضوں سے خائف ہونے کے بجائے ان کا معروضی طور پر جائزہ لے سکتی ہو، اور ان کے ذریعہ سے انسان کو طاقت دیتی ہو، اس سے صحیح طور پر کام لینے کا گر جانتی ہو۔

یہ آواز نئی نہیں پرانی ہے، مگر نرالے انداز میں پیش کی گئی ہے، یہ صرف پروفیسر آل احمد سرور کے دل کی آواز نہیں کہی جا سکتی بلکہ ان تمام مسلمانوں کے دل کی ہے جو ایک طرف تو درخشندہ فلزات بنگلوں کی عمارات، سفیدانِ فرنگی کی کرامات سے مسحور ہو رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ اپنے سینوں میں آتش تکبیر کی بھی دبی رکھتے ہیں، کعبے کو جبینوں میں بسا کر اور قرآن کو سینوں سے لگا کر اپنے نفس سوختہ میں شام وسحر کی تازگی بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور جب نہیں کر سکتے تو گھبرا کر زبان حال سے کہتے نظر آتے ہیں کہ آیات الٰہی کا یہ نگہبان کدھر جائے، یہی ذہنی کشمکش پروفیسر آل احمد سرور کے مقالہ میں ہے جو ان کیلئے دعوت فکر دیتی ہے، جو صحیح معنوں میں اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مقالہ میں حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام کی اصطلاحات استعمال کی ہیں، ان پر مناظرانہ رنگ پیدا ہوگیا، انھوں نے حقیقی اسلام کی تعریف تو صحیح کی کہ یہ اپنے کو خدا کے حوالے کرنے

نام ہے، اگر تاریخی اسلام سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی، اگر تاریخی اسلام کے بجائے اس کی وضاحت پولٹیکل یعنی سیاسی تاریخ کے اسلام سے کر دی جاتی تو پھر کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی، کیونکہ اسلام کو یزید، حجاج بن یوسف، علاء الدین جہاں سوز اور تیمور وغیرہ جیسے ظالم اور سفاک حکمرانوں یا معز الدین کیقباد، محمد شاہ رنگیلے اور جہاندار شاہ جیسے فاسق اور فاجر بادشاہوں کے کرتوتوں کے ذریعہ سمجھنا حقیقی اسلام کے ساتھ بے انصافی ہے۔

مقالہ نگاروں میں پروفیسر طاہر محمود صدر شعبۂ قانون انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی نے اپنی خطابت کا اچھا اثر پیدا کیا، ان کے مقالہ کا عنوان "ریاست جموں وکشمیر میں مسلم پرسنل لا کا پس منظر اور اس کے امکانات" تھا، جو انگریزی میں تھا، مگر بڑے خطیبانہ انداز میں اور پورے اعتماد کے ساتھ اس کی وضاحت اردو ہی میں کی، اس سے پہلے ان کی تقریر انگریزی میں سننے کا اتفاق ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ذہانت اور صلاحیت عطا کی ہے، وہ اگر مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی میں سلامت روی سے استعمال ہوتی رہی تو ان کی دلکش شخصیت مسلمانوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ بن جائے گی، انھوں نے اپنے مقالہ میں اس پر زور دیا کہ ریاست جموں وکشمیر میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلم پرسنل لا کی تدوین شرعی قوانین کے ماتحت ہونا چاہیے، تاکہ کشمیر سے باہر کے مسلمانوں کے لیے نمونہ ہو، اس مقالہ سے غیر کشمیری نمایندوں کو شاید پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ وہاں خانہ داماد، پسر پرودہ، دختر خانہ نشین کو وراثت میں اسلامی شریعت کے بجائے مقامی اور قبائلی روایت کے مطابق حصے دیے جاتے ہیں، مقالہ مفید اور پُرمغز تھا، مگر جب اس پر بحث شروع ہوئی تو بعض کشمیری دانشوروں نے اس پر زور دیا کہ مقامی اور قبائلی روایتوں کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں، لیکن اس کو سوچنا چاہیے کہ جموں وکشمیر کی ریاست سے مسلمانوں کے پرسنل لا کی تدوین میں قیادت نہیں ملے گی تو پھر ہندوستان کے کس گوشہ سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے، اقبال نے کشمیر کے متعلق جو یہ کہا ہے،

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار　　ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

کیا وہ محض شاعری ہی ہے

کشمیر یونیورسٹی کے ایک استاد جناب عبد الاحد صاحب کا بھی ایک مقالہ انگریزی میں "کشمیر میں اسلام۔ اس کے مسائل اور امکانات" کے عنوان سے تھا، لیکن اس میں زیادہ تر یہ دکھایا گیا کہ یہاں اسلام کو کیسے فروغ ہوا، اسی کے ساتھ اس میں کشمیر کے پیروں، پیرزادوں اور بابا داسوں سے مقالہ نگار کے سوء ظن کا اظہار ہے، اور اس سے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ خانقاہوں اور آستانوں کے سامنے جو فقیر بھیک مانگتے ہیں ان میں متولی کا بھی حصہ ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ آخر میں یہ بھی شکایت تھی کہ کشمیریوں کو مرکزی حکومت میں کوئی ملازمت نہیں دی جاتی، وہ بحری، برّی اور ہوائی فوج کی ملازمتوں سے تو بالکل محروم ہیں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بھی ان کا داخلہ نہیں ہوتا۔

جناب سید شہاب الدین دیسنوی کا ایک مقالہ "قرآن اور سائنس" پر تھا، وہ میرے عزیز بھی ہیں، بچپن سے ان کا ساتھ رہا، ان کے اس مقالہ کو سن کر پہلی دفعہ یہ انکشاف ہوا کہ ان کی نظر قرآن مجید پر بھی اچھی ہے۔

جناب ضیاء الحسن فاروقی کا مقالہ تو تقسیم نہیں ہوا، مگر انھوں نے جو کچھ پڑھا اس میں مسلمانوں کے بعض مصلحین پر ان کے اپنے انداز میں کچھ کڑی تنقیدیں تھیں، وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کو ایسے اچھے انداز میں پڑھتے ہیں کہ سننے والوں پر ان کی تنقیص کا برا اثر نہیں پڑتا۔

میرے مقالہ کا عنوان یہ تھا "حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے اجتہادات سے ہم کو کیا ملا اور کیا مل سکتا ہے؟" کئی اور مقالے بھی پڑھے گئے، لیکن کسی وجہ سے نہ سن سکا، ان کا ذکر رہا جاتا ہے۔ سمینار کے ہال کے بغل میں ایک کمرہ نماز کے لیے مخصوص تھا، مگر وہاں کے مصلے پر دو چار دقیانوسی مصلّی ہی ہوتے، ایسے ہی لمحات میں علماء کو ہمارے دانشوروں کی جدید کاری سے وحشت ہوتی ہے جو اسلام سے متعلق اپنے نظری وفکری تصورات کو بڑی بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں،

لیکن جب ارکانِ اسلام کے ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو اُن سے بالکل بیگانہ نظر آتے ہیں۔

ایک رات ہم لوگ جناب شیخ عبد اللہ کے یہاں "وازوان" پر مدعو تھے، جو کشمیر کی بڑی پر تکلف روایتی دعوت ہوتی ہے، ہم لوگ ایک بڑے ہال میں سفید چاندنی پر بٹھائے گئے، تھوڑی دیر میں ایک مدور طشت میں سادہ عمدہ چاول یعنی خشکہ آیا، جس کے اردگرد چار چار آدمی بیٹھ گئے، پھر جن باورچیوں نے جو خاص خاص چیزیں پکائی تھیں، وہ انکی چھوٹی چھوٹی دیگیں سامنے لاکر اپنے بڑے بڑے چمچوں سے مہمانوں کے طشت کے چاول پر ایک ایک چیز رکھتے گئے، طشت کے اردگرد بیٹھنے والوں میں میرے ساتھ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب اور جناب ضیاء الحسن فاروقی تھے، کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب چیزوں کے نام بتاتے گئے کہ یہ رستہ، یہ طین ماش، یہ مرچی، یہ روغن جوش، یہ قورما، یہ کباب سیخ، یہ ہاک، یہ پنیر، یہ بندرو، یہ دہی اور یہ گشتابہ ہیں، طشت پر اتنی چیزیں رکھی گئیں کہ مشکل سے ہم چاروں نے اس کا بیسواں حصہ کھایا ہوگا، جناب سید حامد صاحب بولے کہ یہ ان کی زندگی کی یادگار دعوت ہے، میٹھی چیز میں صرف سوجی کا حلوا تھا، کشمیر میں پلاؤ اور بریانی کا رواج شاید نہیں ہے، سارا زور گوشت کی مختلف چیزوں کی تیاری میں صرف ہوتا ہے، گشتابہ یہاں کی خاص چیز ہے، جو کشمیر کی بہت ہی محبوب، مرغوب اور ہاضم غذا ہے،

کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے بھی ایک رات یہ وازوان تھا، اس میں بھی چیزیں تو یہی تھیں، مگر ہر شخص کے لیے علٰحدہ علٰحدہ پلیٹ تھی،

اس دعوت میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، وہ اردو کے مشہور ادیب جناب مہدی افادی کے لڑکے کے داماد ہیں، مہدی افادی کو جو لگاؤ علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین اور معارف سے رہا، اس کا ذکر رہا،

مسلم یونیورسٹی پر گفتگو شروع ہوئی تو ان سے عرض کیا کہ اس وقت وہاں انیس ہزار لڑکے ہیں، ایک خیال تو یہ ہے کہ یہاں ایسے طلبہ تیار کیے جائیں جو آئی۔ اے۔ ایس، ڈاکٹری، انجینیری اور دوسرے مقابلے کے امتحانات میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوں، مگر ایسے کتنے لڑکے وہاں سے پیدا کیے جا سکتے ہیں، فرض کر لیجیے کہ پانچ ہزار، ایک صاحب بول اٹھے، پانچ ہزار؟ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار، اور وہ بھی مشکل سے۔ عرض کیا کہ مان لیجیے بڑی محنت کی گئی اور مقابلہ کے مختلف امتحانات کے لیے پانچ ہزار تیار کر لیے گئے، تو بقیہ چودہ ہزار کا کیا حشر ہوگا، یہ چودہ ہزار لڑکے تو وہ ہیں جو کسی نہ کسی طرح ڈگری ڈپلومہ حاصل کر کے محض روٹی کمانے میں لگ جائیں گے، جو آگے چل کر چودہ ہزار خاندانوں کی پرورش کریں گے، یہی تو ہمارا اصلی سرمایہ ہوں گے، کیا ان کی فکر بھی اسی طرح ضروری نہیں جس طرح اچھے سے اچھے با صلاحیت لڑکوں کے نکالنے کی ہے، میری ان باتوں کو سن کر جناب سید حامد صاحب نے کہا کہ یہ بھی ضرور سوچنے کی چیز ہے۔

ایک شام ہم لوگ مولوی محمد فاروق میر واعظ کشمیر کے یہاں ایک پر تکلف چائے پر مدعو تھے وہ خود تو موجود نہ تھے، مگر ان کے گھر والوں نے ہر طرح کی پذیرائی کی۔

جناب محمد امین بچھ صاحب اس اثنا میں میرے سایہ بن کر رہے، بقر عید کا دن اپنی فیملی کے ساتھ ان ہی کی پھولوں سے لدی ہوئی اور نئی نویلی دلھن کی طرح سجی سجائی کوٹھی پر ان کے خاندان والوں کے درمیان گذارا، یہاں ان کے بھائی جناب غلام نقشبند بھی آ گئے تھے، وہ اپنی باتوں میں بہت ہی مہذب اور شایستہ تھے، دن کے کھانے میں امین صاحب کا دسترخوان بھی بڑا پر تکلف تھا، مگر ان کے یہاں چیزیں وہی تھیں جو شمالی ہند کی دعوتوں میں ہوا کرتی ہیں، ہر چیز میں صفائی، ستھرائی اور خوش سلیقگی نظر آئی، امین صاحب کو فارسی زبان کے بلند پایہ شعراء کا کلام بکثرت یاد ہے، وہ چاہیں تو دیر تک فارسی اشعار میں گفتگو کر سکتے ہیں، ان کے اس وصف سے برابر

محظوظ ہوتا رہا، وہ اقبال کے بھی بڑے شیدائی ہیں، کشمیر کے علمی حلقہ میں تو اقبال چھائے ہوئے ہیں، بقرعید کی رات کو کھانا محمد امین صاحب کے داماد جناب محمد یعقوب قریشی کی طرف سے تھا، اس میں میرے ذوق کی ساری چیزیں تھیں، البتہ دوسرے دن جناب محمد امین صاحب بچھ کے سمدھی جناب پیر غلام حسین کے یہاں وازوان پر مدعو کیا گیا، تو ایک بار پھر اس کی مختلف چیزوں کو کھانا آسان نہ تھا، یہاں ان کے بھائی جناب میر غلام حسن سے بھی ملاقات رہی جو پرانے علیگ ہیں، اور ڈپٹی کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، ان کے لڑکے امریکہ میں ہیں، ہم لوگوں کا موضوع زیادہ تر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ رہا، کیونکہ اس میں اور مدعوین علیگ ہی تھے، محمد امین صاحب کے بھائی جناب غلام نقشبند (ایم۔ ایس۔ سی) بھی اس دعوت میں تھے، جنھوں نے علی گڑھ کے بہت سے واقعات دہرا کر گفتگو کو دلچسپ بنایا۔

کشمیر میں دو جمعہ کی نمازیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ایک تو جناب امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی خانقاہ معلّی کی مسجد میں پڑھی، جو ہر طرح مرصع اور مزین تھی، اس کی دیواروں پر پوری صنعت گری کے ساتھ قرآنی آیتیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کے اسمائے مبارک وغیرہ کی خطاطی سے آنکھیں روشن ہوئیں، یہاں تین بجے نماز کی جماعت کھڑی ہوتی ہے، اس سے تقریباً دو گھنٹے پہلے ایک قاری صاحب کلام پاک کی مختلف سورتیں، نعتیں، منقبتیں اور دعائیں پڑھ کر مصلیوں کے قلوب کو روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو نعت یا منقبت قاری صاحب پڑھتے اس کو ان کے سامعین دہراتے، جس سے معلوم ہوتا کہ یہ ان سب کے بھی وردِ زبان ہیں، بعض مصلیوں کو روتے ہوئے بھی پایا، قاری صاحب کوئی دعا پڑھتے تو کچھ لوگوں کے ہاتھ والہانہ انداز سے اٹھ جاتے، جیسے وہ دعاؤں کی برکتوں کو سمیٹ رہے ہیں، ایسی پُر کیف اور باوقار نماز جمعہ کہیں اور نہیں پڑھی، امام صاحب نے جمعہ کا خطبہ پڑھنا

شروع کیا تو تمام مصلیوں نے تحریمہ باندھ لیا، نظریں اسی طرح نیچی کیے رہے جیسے اپنی نمازوں میں کرتے ہیں، دوسرے خطبہ میں تحریمہ نہیں باندھا، دعائیں رسمی طور پر نہیں مانگی گئیں، دیر تک خضوع و خشوع کے ساتھ جاری رہیں، ایسی نمازوں سے خاص قسم کی کیفیت کا طاری ہونا لازمی ہے، مسجد کے بغل میں جناب امیر ہمدانی کا حجرہ ہے، جس کے سامنے کھڑے ہو کر مصلی فاتحہ پڑھتے ہیں۔

شالیمار، نشاط باغ، چشمۂ شاہی، ڈل جھیل اور گل مرگ وغیرہ کی بھی سیر کی جہاں گیا، جامی کا یہ شعر ذہن پر چھایا رہا ؎

مقامِ خوب رویاں آں زمین است

بخوبی رشکِ فردوس زمین است

جناب محمد امین بچھ کی مساعی سے کشمیر میں دار المصنفین کی مطبوعات کے سول ایجنٹ جناب شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجر کتب، ایکسچینج روڈ، گاؤکدل سرینگر بنائے گئے، کشمیر کے جو لوگ دار المصنفین کی مطبوعات خریدنا چاہیں، ان کے یہاں سے طلب کر سکتے ہیں۔

سری نگر میں اردو اخبارات پڑھنے کا بھی موقع ملا، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب وہاں سے یہ انگریزی اخبارات کے سائز میں اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، وہاں کا روزنامہ اخبار آفتاب کئی روز پڑھا، معلوم ہوا کہ اس کی اشاعت ۲۰۰۰۰ بیس ہزار سے زیادہ ہے، امید ہے کہ اردو کی اخبار نویسی اور صحافت نگاری میں کشمیر کے اردو روزنامے اہم رول ادا کریں گے۔

—— ❊ ——

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ فلسفۂ خودی :- مرتبہ، جناب نشور واحدی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت ۱۰ روپیہ، پتہ، نیاز احمد واحدی، ۹۰/۳۰ بیکن گنج، کانپور،

جناب نشور واحدی ایک ممتاز شاعر ہیں، اب انھوں نے نثر کی مملکت میں بھی قدم رکھا ہے، یہ غالباً ان کی پہلی نثری تصنیف ہے، اس میں فلسفۂ خودی کی تاریخ بیان کی گئی ہے، مقدمہ میں خودی یا انا کی اہمیت دکھائی ہے جو شعور، خود شناسی اور عرفانِ ذات کے مترادف ہے، اصل کتاب خودی کے متعلق اربابِ فکر و دانش کے افکار و نظریات اور تصورات و اشارات کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک میں عرب و عجم کے نظریاتِ خودی پیش کئے گئے ہیں، اور دوسرے میں ہندوستان کے مسلم مفکرین کے افکار بیان کیے گئے ہیں، سب سے پہلے قرآن مجید سے انسانی عظمت و کرامت اور عبدیت کو پیش کرکے خودی کی اہمیت واضح کی ہے، پھر رمز انا کی تفسیر میں نامور صوفیہ و مشائخ کے اقوال کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں خواجہ حسن بصریؒ، سلطان ابراہیم ادہمؒ، ذوالنون مصریؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، شیخ شبلیؒ اور منصور حلاج کے نظریاتِ خودی پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، پھر حکمائے اسلام کے ارشادات اور فلسفیانہ افکار کی روشنی میں تاریخ خودی بیان کی ہے، اس ضمن میں حکمائے یونان سقراط، افلاطون، ارسطو اور فلاطینس کا ذکر بھی آگیا ہے، اور مسلمانوں کے فرقہ معتزلہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ کے الگ الگ اسکولوں کی نشاندہی کرکے فارابی، ابن مسکویہ، بوعلی سینا، امام غزالی، خیام، حکیم سنائی، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ابن رشد، شہاب الدین مقتول اور شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریۂ خودی کا ذکر ہے، عجمی مفکرین کے نظریۂ خودی اور فلسفۂ عشق کے متعلق معلومات تحریر کرتے ہوئے حکیم نظامی، شیخ عطار، مولانا رومؒ، شیخ سعدیؒ، امام ابن تیمیہؒ، خواجہ محمد بہاء الدین نقشبندیؒ، حافظ شیرازیؒ، ابن خلدون، شیخ عبدالکریم جیلی، مولانا جامی، جمال الدین افغانی، اور نطشے وغیرہ کے نظریاتِ خودی پیش کیے ہیں، دوسرے حصہ میں ہندوستان کے حضرت مجدد الف ثانیؒ، بیدل عظیم آبادی، شاہ نیاز احمد، مرزا غالب اور ڈاکٹر اقبال کے نظریۂ خودی کی وضاحت ہے، لائق مصنف نے خودی کے متعلق ان سب مفکرین کے منتشر خیالات اس طرح یکجا کیے ہیں کہ فلسفۂ خودی کی ایک مرتب تاریخ ہوگئی ہے، جو اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، لیکن ان کی ہر بات اور تمام نتائج سے سب کا اتفاق ضروری نہیں ہے، حوالے عموماً ضمنی اور ثانوی ماخذ کے دئے گئے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں "سب سے پہلے تفسیر ابن کثیر سے ایک عبارت نقل کی جارہی ہے" (صفحہ ۱۲) لیکن یہ عبارت درج نہیں ہے، صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں، "مولانا مودودی نے جو دورِ جدید کے تصورِ عبادت کے معمار ہیں"، معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہے، کتابت و طباعت کے اغلاط بکثرت ہیں، ص ۲۷ پر عرفت کا ر بالکسر لکھ گیا ہے، صحیح بالفتح ہے، ص ۹۰ پر حسن کو حسن لکھا ہے، امام ابن تیمیہؒ کا نام کئی جگہ صرف تیمیہ ہی درج ہے،

مغربی تمدن کی ایک جھلک :- مترجمہ مولانا روشن علی صاحب پرنسپل منبعیہ عربک کالج تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۹۶ قیمت ۱۰ روپیہ، ناشر منبعیہ عربک کالج، میرٹھ،

یہ کتاب ایک ایرانی مصنف سید مجتبیٰ موسوی کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں مغربی تمدن کی جھلک دکھائی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں اسلام کا ذکر ہے، شروع میں مصنف نے مغربی تمدن کی ترقی اور اسکی خوبی کا اعتراف کیا ہے کہ اس کی وجہ سے زندگی کے مختلف شعبوں میں گوناگوں سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں، پھر اس کا دوسرا رخ پیش کرکے تہذیب، معاشرت، سیاست اور تمدن کی خرابیاں دکھائی ہیں اور اخلاقی، روحانی اور مذہبی زوال و انحطاط کا حال تحریر کیا ہے، انھوں نے مغربی زندگی کا یہ تضاد بھی بتایا ہے کہ کچھ لوگوں کو ہر قسم کی آسائش و فراغت میسر ہے، مگر کچھ ...... لوگ نانِ جویں کے محتاج ہیں، ایک طرف کتوں اور بلیوں سے محبت کی جاتی ہے، مگر دوسری طرف انسانوں میں شرِ محبت، اور دوستانہ روابط کی کمی ہے، اور والدین اپنے بچوں کی

پرورش بھی نہیں کرتے، معاشرتی خرابیوں کے ضمن میں نسلی امتیاز، گورے کالے کے فرق، گھریلو اور شہری زندگی کی تلخی، زوجین میں الفت و محبت کے فقدان طلاق کی کثرت رواج، فواحش و منکرات کے فروغ، مہلک اور ایٹمی ہتھیار ایجاد کرنے وغیرہ کا ذکر ہے۔ مصنف نے کلیسا کے مظالم، عیسائیوں کے تصور و طریقہ عبادت کی کی خامیوں اور عبادت گاہوں کو بھی رقص و سرود اور لطف و تفریح کی جگہ بنا لینے کا ذکر کیا ہے اور عیسائی مذہب کی ترقی و اشاعت، عیسائی مشنریوں کی بے نظیر تبلیغی مساعی، مذہب اسلام کے خلاف ان کے زبردست پروپگنڈے اور مسلمانوں کی تبلیغ و اشاعت دین سے غفلت کا افسوس کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، مگر اس کے باوجود اسلام کی مقبولیت میں اضافہ اور افریقہ میں اس کی ترقی کے امکانات بھی دکھائے ہیں، دوسرے حصہ میں دنیا کی موجودہ مشکلات کا حل اسلام کو بتا دیا گیا ہے، اور مغربی مفکرین کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ ان کے تمدن کی اچھی چیزوں میں اسلامی اثرات و نقوش کی چھاپ ہے، جس زمانہ میں مغربی قومیں نیم وحشی تھیں اُس وقت مسلمانوں نے علوم و فنون کو ترقی کی معراج پر پہنچا دیا تھا، اور طبقہ واریت اور نسلی امتیاز کے خاتمہ اور معاشرتی اصلاح کے بارہ میں اسلام کے اصول و آئین بتائے ہیں، اس سلسلہ میں عورتوں کے حقوق، ناگزیر حالات میں طلاق و تعدد ازدواج کی ضرورت واضح کی ہے، مصنف نے جہاد کی حقیقت و غرض بھی بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ اس کا مقصد وحشت و بربریت اور قتل و غارت گری اقوام نہیں ہے، اردو میں اس موضوع پر بعض کتابیں پہلے سے موجود ہیں، یہ کتاب بھی اچھی ہے لیکن اسلامی تاریخ کے واقعات بطور مثال پیش کرتے ہوئے صرف حضرت علیؓ اور عباسی خلیفہ مامون کے دور کے واقعات ہی منتخب کئے گئے ہیں، ایک جگہ دور فاروقی کے واقعات نقل کئے ہیں، مگر حضرت عمر فاروقؓ کا نام نہیں آنے دیا ہے، ایک حقیقت پسند مصنف کو فرقہ و مسلک کے اختلاف سے بالاتر اور اس قسم کی عصبیت سے خالی ہونا چاہئے، متعہ کے جواز اور محاسن کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس مختصر تبصرہ میں اس کی تردید کی گنجائش نہیں، لیکن اس کی حرمت کو صرف حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے قرار دینا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے، ترجمہ میں زبان و بیان کی فرو گذاشتیں رہ گئی ہیں، عبارت میں دلیذ بیانی حشو و زوائد اور لفاظی کے علاوہ جملوں کا دروبست بھی ٹھیک نہیں ہے کہیں تو عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال کئے ہیں اور کہیں رکیک اور سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کی غلطیاں بکثرت ہیں۔ "ض"

ماہ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۱ء عدد ۶

مضامین

دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات

دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر جناب ڈاکٹر خورشید نعمانی رودولوی استاد شعبۂ اردو و فارسی دیانند کالج برلی بمبئی نے یہ پُر از معلومات کتاب لکھکر اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، یہ اپنے موضوع پر اب تک اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی اور منفرد کتاب ہے جس کا انتساب فاضل محقق نے اپنے مربی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے نام کیا ہے۔ قیمت:- ۳۰ روپیے،

"منیجر"